خاص لوگ جو اس آیت سے مراد ہیں، جیسے ابوجہل وغیرہ ان کو ایمان نصیب نہیں ہوا بلکہ وہ کفر کی حالت میں رخصت ہو گئے۔ پس آیت اپنی جگہ ٹھیک رہی اور ختم کے معنی بھی یہی ہوئے کہ ان کے لیے ہدایت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہے۔ خدا تعالیٰ اس حالت سے بچائے۔ آمین ثم آمین۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۲ جمادی الثانی ۱۳۵۹ھ

سوال:۔ ہاروت ماروت فرشتے تھے یا شیطان بعض علماء کہتے ہیں کہ وہ شیطان تھے بادلائل بیان فرمائیں۔ منیر الدین احمد ڈاکخانہ وبلی دیوان گنج ضلع پورنیہ وسائل عبداللطیف علوی

جواب:۔ ہاروت ماروت فرشتے تھے چنانچہ قرآن مجید کے الفاظ اس بات کو واضح کر رہے ہیں۔ ارشاد ہے وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ۔ اس آیت میں ہاروت و ماروت ملکین سے بدل ہے اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب نے اس نسخے کی تابعداری کی جو بابل شہر میں دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اتاری گئی اور جو شیطان کہتے ہیں۔ بعض لوگ ولکن الشیاطین میں شیاطین سے بدل بناتے ہیں۔ حالانکہ اگر اس سے بدل ہوتا تو اس کے ساتھ ذکر ہوتا نیز کفروا وغیرہ صیغے جمع کے اس کے خلاف ہیں۔ غرض قرآنی روش صاف بتا رہی ہے کہ ہاروت ماروت فرشتے تھے۔

علاوہ ازیں وہ جادو سے روکتے تھے اور کہتے تھے کہ کفر نہ کرو اگر وہ شیطان ہوتے تو کفر سے کیوں روکتے

تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض اس قسم کی احادیث بھی آتی ہیں۔ جن میں ذکر ہے کہ فرشتوں نے خدا سے عرض کی کہ اگر انسانوں کی جگہ ہم ہوں تو گناہ نہ کریں۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہاروت وماروت کو خواہشات نفسانی لگا کر بھیجا مگر وہ گناہ سے بچ نہ سکے چنانچہ جامع صغیر اور تفاسیر وغیرہ میں اس قسم کی روایتیں موجود ہیں۔ بیضاوی ہو یا رازی یا کوئی اور جس کا قول مذکورہ بالا بیان کے خلاف ہو وہ صحیح نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ و

۲۵ رجب ۱۳۸۰ھ لاہور

مسئلہ تقدیر

سوال:۔ مسئلہ تقدیر کی کیا حیثیت ہے۔ اور کسب اور خلق میں کیا فرق ہے؟ یعنی جن اشخاص کو خدا تعالیٰ نے دوزخی بنا دیا ہے اور ان کو اسی کے لئے پیدا کیا تو پھر ان پر کیا الزام ہے؟

اور پھر ان سے انبیاء کی اتباع و تصدیق کا مطالبہ کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے ؟

جواب :- مسئلہ تقدیر کی اصلیت دو چیزیں ہیں ایک علم ایک قدرت ، علم اس طرح کہ بندے کو جب خدا نے پیدا کیا تو اس نے نیکی کرنی تھی یا بدی ۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی تھا سو اس کو لوح محفوظ کی صورت میں پہلے ہی لکھ دیا ۔ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ۔ اس لئے بندے نے کیا یہ غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بندے نے کرنا تھا ۔ اس لئے اللہ نے لکھا ہے چنانچہ حدیث میں ہے قلم کو حکم ہوا اُکتب لکھو قلم نے کہا ما اکتب (میں کیا لکھوں) حکم ہوا ۔

" اکتب القدر فکتب ما کان وما ھو کائن الی الابد "

ترجمہ :- تقدیر لکھ ، پس قلم نے جو کچھ ہو چکا تھا اور جو کچھ ہونا تھا لکھ دیا ۔

بتلایئے ! اس میں اللہ کیا قصور ؟ ہاں اگر اللہ کا لکھنا بندے کیلئے رکاوٹ ہوتا ۔ تو پھر اعتراض کرنے والا اعتراض کر سکتا تھا کہ بندے کا کیا قصور ؟ لیکن جب ایسا نہیں بلکہ بندے نے جو کچھ کرنا تھا قلم نے خدا کے حکم سے وہی لکھا پھر اتنے پر بھی بندے کو نہیں پکڑا ۔ بلکہ بندے نے جب فعل کر لیا اس وقت پکڑا پس اب علم کے لحاظ سے کوئی اعتراض نہ رہا ۔ زیادہ وضاحت کے لئے ۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اگر بالفرض خدا کو علم نہ ہوتا تو بھی بندے نے نیکی یا بدی کرنی تھی ۔ تو اللہ کو علم ہونے سے کونسا جبر آگیا ۔

رہا قدرت کا معاملہ سو یہ نہایت نازک ہے بڑے بڑے عقلاء اس میں حیران ہیں ۔ خدا تعالیٰ بندوں کو ہر طرح سے آزماتا ہے ۔ بدنی آزمائشیں بھی آتی ہیں ۔ عقلی بھی ۔ تقدیر کا مسئلہ عقلی آزمائش ہے مگر اس کو ایسا بھی نہیں کیا کہ بالکل مبہم رکھا ہو ۔ بلکہ ایمان کے لئے جس قدر ضرورت تھی اتنا پردہ اٹھا دیا تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر مخالف موافق اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص و عیب سے پاک ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جبر جیسا کوئی نقص نہیں ۔ ایک تو اس میں حکمت کا خلاف ہے کہ خود ہی ایک فعل کرے اور اس پر سزا دے ۔ دوسرے اس میں بندے کو ناحق تکلیف دینا ہے جس کو ادنیٰ سے ادنیٰ عقل والا بھی اچھا نہیں سمجھتا ۔ ایک کی جان دکھ میں ہو ، دوسرے کا تماشہ ، اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے جس کا اثر اس کا خالق ہونا ہے ۔ اگر بندہ بھی خالق ہو تو یہ شرک فی الربوبیت ہے جو بڑا شرک ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ بندہ مجبور بھی نہیں اور مختار مطلق بھی نہیں ۔ بلکہ اس کی حالت بین بین ہے ۔ جس کو کسب اور اکتساب سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ پس ایمان کے لئے اتنی معرفت کافی ہے ۔ کیونکہ ایمان کے لئے

یہ ضروری نہیں کہ حقیقت شے کا علم ہو تب ایمان لائے۔ دیکھئے روح کی حقیقت ہم نہیں جانتے لیکن اس کے آثار کی وجہ سے ہم مانتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر ہم ایمان رکھتے ہیں لیکن کنہ و حقیقت کا علم نہیں۔ ٹھیک اسی طرح کسب و اکتساب کو سمجھ لینا چاہیئے۔ اس سے آگے بحث میں خیر نہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ تقدیر میں بحث سے منع فرمایا ہے۔ میرے ذہن میں اس کے متعلق بہت سے مضامین ہیں۔ کوئی موقع ہوا تو تفصیل ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز

حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ

سوال: حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ کا کیا مطلب ہے۔ فطرت سے مراد طبیعت سلیمہ ہے یا ملتِ اسلام اگر اس سے مراد ملتِ اسلام ہے تو پھر ایک غیر مسلم کے بچے کا شرعی طور سے جنازہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: حدیث "کل مولود" میں فطرت سے مراد اسلام ہے۔ لیکن پیدائشی اسلام جزا سزا کا حقدار نہیں۔ بلکہ کسب پر انسان جزا سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ بچوں کا جنت میں جانا بھی خدا کا ابتداءً احسان ہے کسی عمل کی وجہ سے نہیں۔ جیسے جنت کی حور و غلمان کسی عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں۔ لیکن چونکہ دنیا میں بچوں کی دنیوی تکلیفیں پہنچتی ہیں اس لئے ان کا درجہ حور و غلمان سے بڑا ہوگا۔ جس کی بنا پر ماں باپ کی سفارش بھی کریں گے۔ اور دیگر خصوصیتیں بھی ان کی ہوں گی۔

رہا جنازہ تو اس میں ماں باپ کے تابع ہیں، اگر ماں باپ مسلم ہیں۔ تو جنازہ ہوگا ورنہ نہیں کیونکہ ظاہری احکام میں وہ ماں باپ کے تابع ہیں۔ اسی لئے جنگ میں غلام لونڈیاں بنائے جاتے ہیں۔

سوال: حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ اور حدیث اَلَاۤ اِنَّ بَنِیْ اٰدَمَ خُلِقُوْا عَلٰی طَبَقَاتٍ شَتّٰی فَمِنْهُمْ مَنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَّیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَیَمُوْتُ مُؤْمِنًا وَمِنْهُمْ مَنْ یُّوْلَدُ کَافِرًا وَّیَحْیٰی کَافِرًا وَّیَمُوْتُ کَافِرًا (الحدیث) رواہ الترمذی فی باب ما اخبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصحابہ بما ھو کائن الی یوم القیامۃ (ترمذی مع تحفۃ الاحوذی جلد ۳)

مولانا! آپس میں دونوں حدیثیں متعارض ہیں۔ ان میں تطبیق کی کیا صورت ہے؟ نیز بخاری

شریف سے تمام بچوں کا . . . . . جنتی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ آپ نے اپنے رویا میں اولاد مشرکین کو ابراہیم علیہ السلام کے پاس دیکھا۔ لیکن حدیث ترمذی کی بتلا رہی ہے کہ بعض مولود کی فطرت اور خلقت ہی کفر پہ ہوتی ہے۔ تو وہ جنتی کیسے ہو سکتے ہیں۔ ذرا تدبر سے جواب دیں۔

حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ پر حافظ ابن قیمؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے بڑی بسط سے بحث کی ہے۔ مگر دونوں صاحبوں نے صرف مذاہب مقرر کر دیئے ہیں۔ فیصلہ کچھ نہیں فرمایا۔ حافظ ابن القیمؒ نے اپنی کتاب شفاء العلیل فی القدر والتعلیل میں خوب لکھا ہے آپ ایک نظر اس کو بھی دیکھ لیں۔ یہ کتاب مصر میں چھپ گئی ہے مسئلہ تقدیر میں ایک عجیب تصنیف ہے؟

جواب حدیث ومنہم من یولد کافراً میں بھی یہی کفر مراد ہے کیونکہ کافروں کے بچے ظاہر کافر ہی شمار ہوتے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ کفر پر پیدا ہونے سے یہ مراد ہو کہ سن تمیز کو جب پہنچتے ہیں تو کافر ہوتے ہیں۔ یعنی کفر کے کام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں بالغ ہو جاتے ہیں اور سن تمیز سے پہلے کا زمانہ چونکہ بے خبری کا زمانہ ہے۔ اس لئے اس سن تمیز کے تابع سمجھا جاتا ہے۔ اگر سن تمیز کا زمانہ کفر کا ہے تو پہلا بھی کفر کا ہے۔ اگر سن تمیز کا زمانہ ایمان کا ہے تو پہلا بھی ایمان کا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے سونے کا وقت بیداری کے تابع ہے۔ اگر بیداری میں عبادت کرتا ہے تو نیند میں بھی عابد ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے حدیث میں چار صورتوں پر اکتفاء کی ہے۔ ورنہ صورتیں اور بھی نکل سکتی ہیں۔ مثلاً پیدا مومن ہو زندہ کافر رہے۔ مرتے مومن پیدا کافر ہو، زندہ مومن رہے۔ مرے کافر اور پیدا مومن ہو زندہ کافر رہے۔ مرے کافر اور پیدا کافر ہو، زندہ مومن رہے۔ مرے کافر۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ چار صورتیں اس لئے ذکر کی ہوں۔ کہ دو ایمانوں کے درمیان کفر کالعدم ہے۔ جیسے صحابی کی تعریف میں مشہور ہے کہ درمیان ارتداد آجائے تو وہ کالعدم ہے اور دو کفروں کے درمیان ایمان کالعدم ہے۔ بلکہ نفاق پر دلالت کرتا ہے اور سن تمیز سے پہلے کا کفر اور ایمان بھی بغیر کفر اور ایمان سن تمیز کے کالعدم ہے۔ کیونکہ اس میں کسب کو دخل نہیں۔ پس اکیلا شمار کے قابل نہیں۔

خلاصہ یہ کہ یولد کافراً میں یا تو ماں باپ کی اتباع میں کفر مراد ہے یا سن تمیز کی اتباع میں کفر مراد ہے اور باقی چار صورتیں نہ ذکر کرنے کی وجہ یا تو یہی ہے کہ سن تمیز کی اتباع کفر اور ایمان مراد ہے۔ ان چار صورتوں میں سن تمیز اور سن تمیز سے پہلی حالت ایک نہیں۔ تو پہلی حالت سن تمیز کے تابع کس طرح ہو۔ یا دو

ایمانوں کے درمیان کفر اور دو کفروں کے درمیان ایمان اور سنِ تمیز کے کفر اور ایمان کے بغیر سنِ تمیز سے پہلے کا کفر اور ایمان کالعدم ہے اور کل مولود یولد میں پیدائش اسلام مراد ہے جس کو جدا سوائے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں نہ ماں باپ کی اتباع ہے نہ سنِ تمیز کی اتباع ہے۔ پس دونوں حدیثوں سے تعارض رفع ہو گیا اور جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ عبداللہ روپڑی ۱۰ ربیع الآخر ۱۳۴۹ھ

طاعون سے موت طبعی واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

سوال:۔ ایک شخص کہتا ہے۔ کہ جس جگہ طاعون واقع ہوتی ہے۔ وہاں کے باشندے اپنی طبعی موت سے نہیں مرتے۔ بلکہ طاعون جو غضب الٰہی کی شکل میں وارد ہوتی ہے۔ اس سے مرتے ہیں خواہ ان کی عمر باقی ہو یا پوری کر چکے ہوں۔ اور وہ اس کو بھی مانتا ہے۔ کہ عمر نیکیوں کے سبب بڑھتی ہے اور بداعمالیوں سے گھٹتی ہے جیسا کہ سورۃ نوحؑ کی آیت ویؤخرکم الیٰ اجل مسمّٰی سے واضح ہے۔ چونکہ طاعون عذاب الٰہی ہے اور عذاب الٰہی سوائے بدعملوں کے نہیں آتا۔ لہٰذا طاعون سے جو متواتر مرتے ہیں۔ یہ سب معذب ہوتے ہیں۔ اور وہ عذاب سے قبل از وقت مر جاتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ تقدیر الٰہی میں کسی کے متعلق یہ نہیں لکھا گیا کہ وہ جنتی یا ناری ہے۔ شقی یا سعید ہے۔ اگر ایسا ایمان رکھا جائے تو اعمال کا کیا فائدہ جو عمل کیا جاتا ہے بعد وقوع وہ لکھا جاتا ہے۔

دوسرا شخص کہتا ہے۔ کہ طاعون سے جو شخص مرتا ہے۔ اس کی عمر اس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور جس کی عمر باقی ہوتی ہے وہ طاعون سے نہیں مرتا۔ عمر کا کم و بیش ہونا عام اور کلیہ نہیں۔ ہاں بعض نیک عمل اور بدعمل عمر کی بیشی اور کمی کا سبب ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی تقدیر الٰہی سے ہوتا ہے قضا مبرم میں نہ معلق میں اور ہر آدمی کے متعلق تقدیر میں لکھا ہوا ہے کہ وہ جنتی ہے یا ناری ہے۔ شقی ہے یا سعید ہے۔

ان ہر دو شخصوں میں کون حق پر ہے۔ جو تحقیقات کے بعد حق کو نہ مانے اس کو امام بنانا درست ہے۔ سائل احمد دین از بستی ماں ڈاکخانہ مخدوم رشید ضلع ملتان ۲۷ شوال ۱۳۴۲ھ

جواب:۔ آپ نے جو کچھ سوال کیا ہے۔ اس کا جواب خیر القرون میں دیا جا چکا ہے۔ تاریخ ابن جریر

جلد ۴ صفحہ ۱۹۹ میں ہے۔ کہ حضرت عمرؓ جب ملک شام کو گئے رستہ میں خبر ملی کہ شام میں طاعون کا زور ہے۔ تو لوگوں نے جمع ہو کر مشورہ کیا۔ کہ شام کو جائیں یا نہ پہلے مہاجرین کو بلایا۔ ان کا اختلاف ہو گیا۔ کسی نے کہا جانا چاہیئے۔ کسی نے کہا نہ جانا چاہیئے۔ پھر انصار کو بلایا۔ ان کا بھی اس طرح اختلاف ہو گیا۔ پھر پُرانے پرانے مہاجرین کو بلایا۔ ان سب نے بیک زبان یہی کہا۔ کہ نہ جانا چاہیئے۔ آپ نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ ابو عبیدہ بن جراح جو شام میں فوجوں کے سپہ سالار تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُمّت کے امین کا خطاب فرمایا ہوا تھا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ پر اعتراض کیا۔ کہ آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگتے ہیں۔ (اس لئے کہ شام میں جا کر مریں گے تو تقدیر الٰہی سے مریں گے) حضرت عمرؓ نے فرمایا کاش یہ کلمہ تیرے جیسے سمجھدار کی زبان سے نہ نکلتا۔ ہاں ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔ یعنی جیسے شام میں جا کر مرنا اللہ کی تقدیر سے ہوگا۔ اسی طرح واپسی کا معاملہ بھی اللہ کی تقدیر سے ہوگا۔ پھر حضرت عمرؓ حضرت ابو عبیدہ بن جراح سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف آ گئے۔ جو مشورہ کے وقت موجود نہ تھے۔ کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔ کہ جہاں طاعون ہو وہاں نہ جاؤ۔ اگر تمہاری زمین میں پڑ جائے۔ تو وہاں سے بھاگ کر نہ نکلو حضرت عمرؓ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ میری رائے حدیث کے موافق ہو گئی۔ انتہی

اس سے معلوم ہوا۔ کہ طاعون وغیرہ میں مرنا یا بچنا یہ سب تقدیر الٰہی سے ہوتا ہے۔ اور کسی کا سعید یا شقی لکھا ہونا اس کی بابت تو مشکوٰۃ وغیرہ میں کثرت سے احادیث موجود ہیں اور عمل کی بابت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہو چکا ہے۔ جس کا جواب آپ نے یہ دیا۔ کہ فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ چنانچہ مشکوٰۃ وغیرہ میں یہ حدیث موجود ہے۔

غرض سب معاملہ تقدیر سے ہے۔ لیکن تقدیر جبر کا نام نہیں۔ بلکہ خدا نے اپنا علم لکھ دیا ہے اور ظاہر ہے کہ علم ایک چیز ہے اور فعل الگ مثلاً مجھے کشف والہام سے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص کل چوری کرے گا۔ اور میں اس بات کو لکھ دوں یا لوگوں کو اطلاع کر دوں پھر وہ شخص چوری کرے تو یہ چوری اسی کا قصور سمجھا جائے گا۔ کیونکہ فعل چوری کا مجھ سے صادر نہیں ہوا پس اللہ تعالیٰ کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ جان لینا یا لکھ دینا الگ چیز ہے۔ اور جو تقدیر پر ایمان نہ رکھے وہ فرقہ قدریہ سے ہے۔ جو گمراہ فرقہ ہے۔

عبد اللہ امرتسری مورخہ ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۴۲ھ

سوال: کسب اور خلق میں کیا فرق ہے؟

جواب:۔ خلق نیست سے ہست کرنا اور عدم سے وجود میں لانا۔ کسب کسی امر کا قصد اور ارادہ کرنا اور اس کے قصد ارادے کے مطابق خدا تعالیٰ کا اس کے اعضاء میں حرکت پیدا کر دینا۔

کسب میں کچھ احتیاجی کا بھی شائبہ ہوتا ہے یعنی کسی اپنی کمی اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ قصد ارادہ ہوتا ہے اس لئے اس کی نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے خدا کی طرف نہیں ہوتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۶ شعبان ۱۳۵۲ھ

جب جن اور انسان عبادت کیلئے پیدا کئے گئے تو پھر اسکے خلاف کیوں؟

سوال:۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ ہم نے جن اور انسان کو اپنی عبدیت کے لئے پیدا کیا تو پھر کیا وجہ کہ اس کے خلاف بہت کچھ ہو رہا ہے کیوں نہیں علت غائی کا پورے طور پر ظہور ہوا۔

جواب:۔ جن و انسان کی پیدائش کی غرض و غایت اگرچہ عبدیت اور عبادت ہے مگر فعل پر جو غایت مرتب ہوتی ہے کبھی وہ اختیاری ہوتی ہے اور کبھی غیر اختیاری۔ ثانی الذکر چونکہ طبعی شئے ہے اس لئے سنت اللہ کے مطابق وہ ضرور مرتب ہوتی ہے اور اول الذکر کے متعلق خدا نے بندے کو اختیار دیا ہے۔ اس لئے اگر وہ اپنا اختیار موافق برتے یا خلاف برتے ہر طرح برت سکتا ہے۔ اور اسی قسم کا اس پر نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ مثلاً عبدیت اور عبادت کے لئے پیدا کیا ہے، اگر اس نے ایسا عمل کیا جو عبدیت اور عبادت کی قسم سے ہے تو اس کی پیدائش کی غایت حاصل ہو گئی اگر اس نے اس کے خلاف عمل کیا تو غایت فوت ہو گئی اور اسی لئے وہ مجرم کہلایا اور خدا پہ ناکامی کا الزام اس لئے نہیں آ سکتا کہ خدا نے خود بندے کو اختیار دیا ہے ہاں اگر خدا بندے کو اختیار نہ دیتا تو پھر خدا پہ ناکامی کا الزام آ سکتا تھا، اب نہیں۔

جب دو شخص عمر اور جرم میں برابر ہوں تو انکی سزا میں کیوں فرق ہے

سوال:۔ زید اول آفرنیش دنیا میں پیدا ہوا اور پچاس ساٹھ برس کی عمر پا کر مر گیا اور عمرو وقوع قیامت سے پچاس ساٹھ برس پہلے پیدا ہوا اور اتنی ہی عمر پا کر یہ بھی مر گیا اور دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ لہٰذا اسلام کی رو سے زید کو قبر کا عذاب عمرو سے ہزاروں برس زیادہ دیا گیا حالانکہ جرم میں دونوں برابر ہیں۔ یہ کیوں ہے؟

جواب:۔ زید کو جتنا عذاب قبر قیامت سے پہلے ہو چکا ہے اُسی قدر میدان حشر میں اور دوزخ میں عذاب کی تخفیف ہو جائے گی۔ یعنی زید کا عذاب ہلکا ہوگا۔ اور عمرو کا عذاب سخت ہوگا۔ آپ نے کمی بیشی عذاب صرف مدت کی کمی بیشی میں سمجھی ہے اس لئے اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ نفس عذاب میں بھی تخفیف اور سختی کے لحاظ سے فرق پڑ جاتا ہے۔ سو جتنی مدت زید کو زیادہ عذاب ہوا اسی اندازے پر عمرو کا عذاب سخت ہوگا اور زید کا ہلکا۔

موحد غیر مسلم عابد زاہد اور مسلمان بدکردار ہر دو کے ساتھ خدا کا کیا برتاؤ ہوگا

سوال:۔ خدا تعالیٰ اپنی کلام میں فرماتا ہے کہ میری رحمت ہر ایک چیز کو پہنچتی ہے اور میری تسبیح و تہلیل زمین و آسمان کی ہر ایک چیز کرتی ہے ایک شخص موحد غیر اپنے مذہب کے موافق متقی و پرہیزگار عابد و زاہد غیر اسلام پر مرتا ہے اور ایک شخص جو رسالت کا قائل ہے اور الوہیت کے ماننے میں اس کے برابر ہے لیکن وہ نہ عابد ہے اور نہ زاہد اور نہ متقی ہے نہ پرہیزگار نہ نیکوکار ہے ان دونوں کے ساتھ خدا کا کیا برتاؤ ہوگا؟

جواب:۔ جس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری رحمت ہر ایک چیز کو پہنچتی ہے اُسی میں یہ بھی ہے کہ یہ رحمت آگے چل کر مومن کے لئے خاص ہو جائے گی چنانچہ پوری آیت یہ ہے۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ۔

"میری رحمت نے ہر شئے کو گھیر لیا ہے۔ عنقریب میں اس رحمت کو ان لوگوں کے لئے لکھ دونگا خاص کر دوں گا جو پرہیزگاری کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جب تک قرآن مجید پر اور رسالت پر ایمان نہ ہو نجات کا مستحق نہیں کیونکہ آگے اس کے آیت میں ان کی صفت میں ارشاد ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

"متقی پرہیزگار اور ہماری آیتوں پر ایمان رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو رسول نبی ان پڑھ کے

تمیع میں جس کا ذکر توراۃ اور انجیل میں ہے ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے اور ان سے انکے بوجھ اور طوق رکھتا ہے جو ان پر تھے پس جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائیں اسکو تائید دیں اور اسکی مدد کریں اور اس نور کی تابعداری کریں جو اسکے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ یہ لوگ ہی نجات پانے والے ہیں۔"

اس آیت نے معاملہ بالکل صاف کر دیا کہ متقی و پرہیزگار وہی ہے جو اُن پڑھ رسولؐ پر اور قرآن مجید پر ایمان رکھے اور وہی مستحق نجات ہے۔ غیر مذہب نہ تو متقی و پرہیزگار ہے نہ وہ نجات کا اہل ہے رہا مسلمان جو رسالت کا قائل ہے اور الوہیت کو مانتا ہے لیکن پرہیزگار نہیں تو اس کے متعلق قرآن و حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ آخر نجات پائے گا۔ چنانچہ شفاعت کی حدیث میں ہے کہ اہل توحید دوزخ سے نکالے جائیں گے۔

گناہ کی زندگی محدود اور سزا لامحدود

سوال:- زید کافر سو برس زندہ رہا۔ اس عرصہ میں گناہ بھی کئے زندگی محدود میں محدود گناہ کئے پھر کیا وجہ کہ اس کافر کو لاالی نہایت دوزخ میں ہمیشہ رہنا پڑے گا!

جواب:- آپ کے اس اعتراض کی بناء اس پر ہے کہ جتنی مدت گناہ کی ہو اتنی مدت سزا کی ہونی چاہیئے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ایک شخص تھوڑی دیر میں چوری کرتا ہے اور عمر بھر قید کر دیا جاتا ہے یا ہمیشہ کے لئے اس کو کالا پانی کی سزا دی جاتی ہے۔ پس محدود عمر کی سزا غیر محدود ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے علاوہ جس نے ایمان نہیں لانا ہوتا اگر وہ ہمیشہ زندہ رہے تو ہمیشہ گناہ میں ترقی کرے گا۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ جس شخص کا قصد ہمیشہ جرم کا ہو وہ اپنے قصد کے لحاظ سے ہمیشہ کا مجرم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص کو حاکم کہے کہ اس جرم سے توبہ کر، تو وہ حاکم کو آگے سے جواب دے کہ میں ہمیشہ اسی طرح ہی کروں گا اب تبلایئے وہ ہمیشہ کا مجرم سمجھا جائے گا یا صرف اُسی وقت کے لئے جس وقت وہ یہ کلمہ کہہ رہا ہے ٹھیک اسی طرح خدائی مجرم کو سمجھ لیں۔ جس کا قصد ہمیشہ کے لئے جرم کے ارتکاب کا ہے۔

نومسلم کا کسی وجہ سے اسلام کا اظہار نہ کرنا

سوال:- ایک ہندو خفیہ طور پر اسلام کو مانتا ہے الوہیت اور رسالت کا قائل ہے دو مسلمانوں کو اپنی زبان سے کلمہ طیب سُنا کر گواہ بناتا ہے لیکن اظہار اسلام اس لئے نہیں کرتا کہ میں اس

حالت میں شریف القوم ہوں اگر اسلام ظاہر کردوں تو تو مسلم بھنگی چماروں کے برابر داخل اسلام ہو کر کہا جائے گا اور میری اولاد کا تعلق یا شادی بیاہ کا رشتہ چھوٹی قوموں میں کرنا پڑے گا۔ اس حالت میں اگر یہ شخص مرجائے تو اللہ تعالیٰ اُس کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا؟

جواب:- اس ہندو کی مثال بالکل ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی مثال ہے وہ بھی قومی عار کی وجہ سے اسلام کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اور یوں کہتا تھا کہ اسلام سچا دین ہے اور سب دینوں سے بہتر ہے چنانچہ اس کا یہ شعر ہے ؎

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِیْنَ مُحَمَّدٍ   مِنْ خَیْرِ اَدْیَانِ الْبَرِیَّةِ دِیْنًا

(میں نے جان لیا کہ محمدؐ کا دین تمام دینوں سے بہتر ہے یعنی توحید جو لاالٰہ اللہ کا مضمون ہے)

اس شعر میں ابوطالب کا کلمہ کی بابت اقرار ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کیا جس کی وجہ اگلے شعر میں بیان کی ہے جو یہ ہے ؎

لَوْلَا الْمَلَامَةُ اَوْحِذَارُ مَسَبَّةٍ   لَوَجَدْتَنِیْ سَمْحًا بِذَاكَ مُبِیْنًا

(اگر ملامت اور لوگوں کے طعن و تشنیع کا ڈر نہ ہوتا تو میں تیرے دین کا خوشی سے اظہار کرتا)

لوگوں کی ملامت اور طعن و تشنیع سے یہی مراد ہے کہ لوگ کہیں گے اتنا بڑا ہو کر اپنے بھتیجے کے پیچھے لگ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ابوطالب نے آپ کی اتنی امداد کی آپ نے اس کو کیا فائدہ پہنچایا؟ آپ نے فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ میں اس کو نجات تو نہیں دلا سکا لیکن عذاب میں سب کافروں سے ہلکا ہوگا۔ اس کو آگ کا جوتا پہنایا جائے گا جس سے اس کا دماغ ہنڈیا کی طرح اُبلے گا۔ اگر میں نہ ہوتا تو جہنم کے نچلے طبقہ میں ہوتا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا صرف قومی طعن کی وجہ سے اسلام کے اظہار نہ کرنے پر ہمیشہ کے لئے جہنمی ہوگیا تو دوسرا کس طرح اُمیدوار نجات ہو سکتا ہے؟

حدیث کے صحت و ضعف میں اختلاف

سوال:- صحت و ضعف حدیث میں جب محدثین کا اختلاف ہو تو ترجیح اصحاب صحاح ستہ محدثین کے قول کو دینا یا اصول محدثین متاخرین کے قول پر رکھنا ہے یا نہیں؟ اور اس پر محدثین کا کلیہ

فائدہ کیا ہے کیونکہ ہر ایک مذہب والا اپنی مستند روایت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کسی نہ کسی محدث کی تصحیح و توثیق کو ذکر کرتا ہے جس سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے ؟

جواب :۔ آپ کے سوالات کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ شرح نخبہ میں ہے :۔

الجرح مقدم على التعديل ان صدر مبينا من عارف باسبابه

فان خلا المجروح عن التعديل قبل الجرح منه مجملا على المختار (شرح نخبہ بحث جرح تعدیل)

یعنی جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ بشرطیکہ اس کی وجہ بیان کی جائے۔ اور جرح کرنے والا اس فن میں پورا ماہر ہو۔ اگر راوی مجروح کی کسی نے تعدیل نہ کی ہو تو پھر مختار مذہب یہ ہے کہ جرح مبہم بھی قبول کی جائے گی۔

اس عبارت میں آپ کے سوال کا جواب ہے کہ اختلاف کے موقعہ پر ہر ماہر فن کا قول اس بارہ میں معتبر ہے مگر مبہم نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ضعف کی وجہ بھی بیان کرے ہاں اگر اختلاف نہ ہو تو پھر وجہ بیان کرے یا نہ کرے دونوں صورتوں میں ماہر فن کا قول معتبر ہوگا گویا اختلاف نہ ہونے کے وقت صرف ایک شرط ہے۔ کہ اس فن میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ اور اختلاف کے وقت دو شرطیں ہیں، پوری مہارت اور وجہ ضعف کا بیان جب پوری مہارت شرط ہوئی تو قطعاً کوئی زیادہ ماہر ہوگا اتنا ہی اس کا قول زیادہ قابل قبول ہوگا۔ خواہ وہ اصحاب صحاح ستہ سے ہو۔ جیسے امام احمدؒ علی بن مدینی، یحییٰ بن سعید قطان اور ان کے مثل، یہ اصحاب ستہ نہیں، مگر اصحاب ستہ خود ان کے قول پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جو لوگ اصحاب ستہ کو ان بزرگوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ جادۂ مستقیم پر نہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں کہ اصحاب ستہ ان کے خوشہ چین ہیں ایک امام بخاریؒ ان کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ باقی سب ان سے نیچے ہیں۔

ایک بات یہاں یہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے، کہ فن حدیث کی بنا چونکہ رائے قیاس پر نہیں بلکہ واقعات پر ہے۔ اس لئے اس فن کے ماہروں میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ امام ذہبیؒ کہتے ہیں :۔

لم يجتمع اثنان من علماء هذا الشان على توثيق ضعيف ولا على تضعيف ثقة (شرح نخبہ بحث جرح تعدیل)

" یعنی دو محدث بھی کسی ضعیف راوی کی توثیق پر اور ثقہ راوی کی تضعیف پر جمع نہیں ہوئے "

جب دو محدث بھی ضعیف کے ثقہ اور ثقہ کے ضعیف کہنے پر متفق نہیں ہوتے تو اختلاف کا دائرہ بہت محدود ہو گیا ایسی حالت میں جس کو خدا نے تھوڑی سی بہت علمی قابلیت عنایت کی ہو اور اس کی نیت میں اخلاص اور طبیعت میں انصاف ہو تو اس کے لئے یہ معمولی اختلاف کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ اول تو وہ خود ہی فریقین کے کلام سے راجح مرجوح معلوم کرے گا۔ ورنہ اپنے سے اعلم کی طرف رجوع کرے گا۔ اصحاب ستہ کو اس بارہ میں معیار مقرر کرنا اور ہر اختلاف کے موقعہ پر انہی کے قول کو ترجیح دینا یہ اسی تقلیدی جمود سے مشابہت ہے جو مقلدین ائمہ میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً حنفیہ نے اپنے مذہب کی بناء زیادہ تر تین اصحاب (امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین) پر رکھی ہے۔ اب جو صرف چھ کو مانے اور ان کے برابر یا ان سے بڑوں کی پرواہ نہ کرے وہ انہی سے مشابہت کنندہ ہوا یا نہ؟ یہی وجہ ہے کہ اصول حدیث میں اصحاب ستہ کو دیگر امامانِ حدیث پر کوئی ترجیح نہیں دی۔ بلکہ اصول حدیث میں ان کے خلاف موجود ہے۔ دیکھئے (اصحاب ستہ میں امام بخاریؒ سب سے اول نمبر ہیں ان کا دوسرے اماموں کے ساتھ اصح الاسانید میں اختلاف ہے یعنی اس بارے میں اختلاف ہے کہ سب سے زیادہ صحیح اسناد کونسی ہے امام اسحٰق بن راہویہؒ کہتے ہیں سب سے زیادہ صحیح زُهْرِیْ عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِیْهِ اور امام احمد بن حنبلؒ بھی اسی طرح کہتے ہیں۔ اور امام عمرو بن علی فلاسؒ کہتے ہیں مُحَمَّدُ بْنُ سِیْرِیْنَ عَنْ عَبِیْدَةَ عَنْ عَلِیٍّ ہے اور امام بخاریؒ کے استاذ امام علی بن مدینیؒ بھی اسی طرح کہتے ہیں۔ اور بعض دیگر محدثینؒ بھی یہی کہتے ہیں پھر بعض نے کہا ہے کہ یہ اصح الاسانید اس وقت بنے گی جب کہ محمد بن سیرینؒ سے ایوب سختیانیؒ روایت کریں۔ اور بعض نے کہا ہے ابن عونؒ روایت کریں۔ اور امام یحییٰ بن معینؒ کہتے ہیں کہ اصح الاسانید اَعْمَشْ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ہے۔ اور امام ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ کہتے ہیں۔ کہ اصح الاسانید زُهْرِیْ عَنْ عَلِیِّ ابْنِ الْحُسَیْنِ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ عَلِیٍّ رضؓ ہے اور امام بخاریؒ کہتے ہیں۔ اصح الاسانید مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرؓ ہے۔ اور امام ابو منصور عبد القادر بن طاہر تمیمیؒ اسی پر بنا رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اسناد شَافِعِیْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضؓ مقدمہ ابن الصلاح کے صفحہ میں اس اختلاف کو اضطراب کہا ہے اور اضطراب وہ اختلاف ہے جس میں کسی جانب کو ترجیح نہیں ہوتی۔ اور حافظ ابن حجرؒ شرح نخبہ میں اس کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

والمعتمد عدم الاطلاق لترجمة معينة منها (شرح نخبه بحث خبر صحیح)

یعنی قابل اعتماد بات یہ ہے کہ (بوجہ اختلاف ائمہ حدیث) ان اسانید سے کسی کو معین کر کے اصح الاسانید

نہیں کہہ سکتے۔

خیال فرمائیں کہ امام بخاریؒ کا اس بارے میں کوئی خاص لحاظ نہیں کیا گیا۔ اگر اصحاب ستہ کے قول کو ترجیح ہوتی تو قول نمبر اس میں امام بخاریؒ تھے۔ جب ان کے قول کو ترجیح نہ ہوئی تو باقی کو بطریق اولیٰ نہ ہوئی پس اصحاب ستہ کو اس بارے میں کوئی خصوصیت نہیں بلکہ جتنا کوئی اس فن میں زیادہ ماہر ہوگا اتنا ہی اس کا قول زیادہ قابل اعتماد ہوگا۔ ہاں اصحاب ستہ کو ایک اور وجہ سے ترجیح ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ان کی چھ کتابیں دوسری کتب پر ترجیح رکھتی ہیں۔ یعنی ان چھ کتب کی احادیث بلحاظ صحت دیگر کتب پر مقدم ہیں۔ مثلاً جیسے بخاری کی احادیث مسلم کی احادیث پر اور مسلم کی ترمذی وغیرہ پر مقدم ہیں۔ اسی طرح ترمذی وغیرہ کی صحیح احادیث دیگر کتب پر مقدم ہیں۔ اگر تعارض کے وقت موافقت نہ ہو سکے تو ان کے مقابلہ میں دیگر کتب کی احادیث متروک العمل ہوں گی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتب کثرت تداول اور علماء امت میں عام قبولیت کی وجہ سے غلطی سے مامون و مصئون ہیں۔ نہ کسی کو ان میں دست اندازی کی گنجائش ہے۔ قریب قریب ایسی ہیں جیسے قرآن مجید حد تواتر کو پہنچ گیا ہے۔ گویا ان کی احادیث کو محدثین کے ہاں خوب چھان بین ہو چکی ہے اس لئے ان کی صحیح احادیث دوسری کتب کی صحیح احادیث پر مقدم ہوں گی۔ ہاں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسری کتب کی کوئی حدیث دیگر قرائن کی وجہ سے صحت میں بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً کئی صحیح سندوں سے مروی ہو یا ایسی اسناد سے مروی ہو جس کو کسی بڑے محدث نے اصح الاسانید کہا ہے اور ان چھ کتابوں کی حدیث میں یہ بات نہ ہو یا کسی اور وجہ سے ترجیح ہو تو ایسی حالت میں دوسری کتب کی حدیث مقدم ہوگی۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے شرح نخبہ میں صحیح حدیث کے درجات بیان کرتے ہوئے تصریح کی ہے کہ ایسے موقعہ پر مسلم کی احادیث بخاری کی احادیث پر اور بخاری مسلم کی احادیث پر دیگر کتب کی احادیث مقدم ہوں گی۔ ٹھیک اسی طرح ترمذی ابو داؤد وغیرہ کو سمجھ لینا چاہیئے۔ غرض دیگر وجوہ سے ترجیح ہو جائے تو دوسری کتب کی احادیث مقدم ہو سکتی ہیں۔ ورنہ اصل یہی ہے کہ ان چھ کتب کی صحیح احادیث کو ترجیح ہو۔ لیکن ان چھ کتب کی صحیح احادیث کو ترجیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اب ان اصحاب ستہ کی دوسری کتب کو یا ان کی ہر ایک بات کو ترجیح ہو کیونکہ چھ کتب کی ترجیح کی وجہ کثرت تداول اور علماء امت میں عام قبولیت اور غلطی سے مامون و مصئون ہونا ہے۔ لیکن ان کی دوسری کتب میں یہ بات نہیں نہ ان کی ذات کو بلحاظ تبحر علمی کے دوسرے تمام ائمہ حدیث پر ترجیح ہے بلکہ کئی اور ان سے بڑھ کر ہیں۔ یا ان کے برابر ہیں۔ چنانچہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

ایک بات یہاں پر یہ بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ فن حدیث چونکہ واقعات پر مبنی ہے اور محض نقل کی قسم سے ہے اس لئے زیادہ ماہر اس میں وہی ہو سکتا ہے۔ جو قرب کے زمانہ میں ہوا اور رائے قیاس کو اس میں دخل نہ دے۔ اگر ان دونوں شرطوں سے کوئی فوت ہو جائے تو اس کی مہارت بھی کالعدم ہوگی یا کم ہوگی۔ مثلاً ایک راوی کے حالات جیسے اس کے ہمعصر علماء کو یا اس کے قرب والوں کو معلوم ہو سکتے ہیں ہمیں معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کے مقابلہ میں ہماری مہارت کا کچھ اعتبار نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک شخص واقعات اور حالات فراہم کرنے کے لئے اپنی زندگی کچھ یا ساری وقف کر دیتا ہے اور ایک شخص گھر بیٹھا ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ پر اور ایک حالت کو دوسری حالت پر قیاس کر کے نتائج اخذ کرتا ہے یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ پہلے کے مقابلہ میں دوسرے کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ مثلاً محدثین کا اصول ہے کہ مرسل حدیث حجت نہیں خاص کر متصل کے مقابلہ میں۔ کیونکہ مرسل حدیث وہ ہے کہ تابعی کہے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔ اور درمیان صحابی کا نام نہ لے اور واقعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ بہت دفعہ تابعی صحابی سے روایت نہیں کرتا بلکہ دوسرے تابعی سے کرتا ہے۔ اور حافظ ابن حجر رہ نے شرح نخبہ میں مرسل کی بحث میں لکھا ہے۔ کہ تفتیش حالات سے معلوم ہوا ہے کہ ایک تابعی دوسرے سے وہ تیسرے سے وہ چوتھے سے اس طرح سات تک روایت پائی گئی ہے۔ اور تابعی سارے کے سارے ثقہ نہیں بلکہ ان میں بہت ضعیف بھی ہیں۔ اس لئے مرسل حجت نہیں۔ ہاں اگر تابعی کے حالات سے معلوم ہو جائے کہ وہ ثقہ ہی سے روایت کرتا ہے۔ جیسے سعید بن مسیبؒ تو ایسے تابعی کی روایت کو امام شافعیؒ وغیرہ معتبر کہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو معتبر نہیں۔ جیسے زُہری وغیرہ کی روایت۔ غرض یہ اصُول تو جیسا کچھ ہے واقعات اور حالات پر مبنی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں حنفیہ کا اصُول ہے، کہ تابعی تو کجا تبع تابعی اگر قال رسُول اللہ وغیرہ کہہ دے (جس کو محدثین کی اصطلاح میں منقطع کہتے ہیں) تو وہ بھی حجت ہے۔ حجت ہی نہیں بلکہ متصل (جس میں تابعی صحابی سے روایت کرے اور صحابی قال رسُول اللہ وغیرہ کہے) پر بھی مقدم ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ تابعی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کا نام لے گا تو ساری ذمہ داری تابعی پر عائد ہوگی، اس لئے جب تک اس کو پُوری تسلی نہیں ہوگی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں لے سکتا۔ ورنہ خطرہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر مفتری ٹھہرے برعکس اس کے جب صحابی کا نام لے گا۔ کہ اس نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح روایت کیا ہے۔ تو اُس صُورت میں تابعی نے صحابی پر ساری ذمہ داری ڈال دی۔ اور جب ذمہ داری دوسرے پر ہوتی ہے۔ تو انسان کو اتنا فکر نہیں ہوتا۔ بلکہ بے پرواہی سے نقل کر دیتا ہے۔ اس لئے مرسل تو کجا منقطع بھی صرف حجت

ایک بات یہاں پر یہ بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ فن حدیث چونکہ واقعات پر مبنی ہے اور محض نقل کی قسم سے ہے اس لئے زیادہ ماہر اس میں وہی ہو سکتا ہے۔ جو قرب کے زمانہ میں ہو اور رائے قیاس کو اس میں دخل نہ دے۔ اگر ان دونوں شرطوں سے کوئی فوت ہو جائے تو اس کی مہارت بھی کالعدم ہوگی یا کم ہوگی۔ مثلاً ایک راوی کے حالات جیسے اس کے ہمعصر علماء کو یا اس کے قرب والوں کو معلوم ہو سکتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کے مقابلہ میں ہماری مہارت کا کچھ اعتبار نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک شخص واقعات اور حالات فراہم کرنے کے لئے اپنی زندگی کچھ یا ساری وقف کر دیتا ہے اور ایک شخص گھر بیٹھا ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ پر اور ایک حالت کو دوسری حالت پر قیاس کر کے نتائج اخذ کرتا ہے یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ پہلے کے مقابلہ میں دوسرے کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ مثلاً محدثین کا اصول ہے کہ مرسل حدیث حجت نہیں خاص کر متصل کے مقابلہ میں، کیونکہ مرسل حدیث وہ ہے کہ تابعی کہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔ اور درمیان صحابی کا نام نہ لے اور واقعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ بسا اوقات تابعی صحابی سے روایت نہیں کرتا بلکہ دوسرے تابعی سے کرتا ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے شرح نخبہ میں مرسل کی بحث میں لکھا ہے کہ تفتیش حالات سے معلوم ہوا ہے کہ ایک تابعی دوسرے سے وہ تیسرے سے وہ چوتھے سے اس طرح سات تک روایت پائی گئی ہے اور تابعی سارے کے سارے ثقہ نہیں بلکہ ان میں بہت ضعیف بھی ہیں۔ اس لئے مرسل حجت نہیں۔ ہاں اگر تابعی کے حالات سے معلوم ہو جائے کہ وہ ثقہ ہی سے روایت کرتا ہے۔ جیسے سعید بن مسیبؒ تو ایسے تابعی کی روایت کو امام شافعیؒ وغیرہ معتبر کہتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو معتبر نہیں۔ جیسے زہری وغیرہ کی روایت۔ غرض یہ اصول تو جیسا کچھ ہے واقعات اور حالات پر مبنی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں حنفیہ کا اصول ہے، کہ تابعی تو کجا تبع تابعی اگر قال رسول اللہ وغیرہ کہہ دے (جس کو محدثین کی اصطلاح میں منقطع کہتے ہیں، تو وہ بھی حجت ہے۔ حجت ہی نہیں بلکہ متصل (جس میں تابعی صحابی سے روایت کرے اور صحابی قال رسول اللہ وغیرہ کہے) پر بھی مقدم ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے گا تو ساری ذمہ داری تابعی پر عائد ہوگی۔ اس لئے جب تک اس کو پوری تسلی نہیں ہوگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں لے سکتا۔ ورنہ خطرہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مفتری ٹھہرے برعکس اس کے جب صحابی کا نام لے گا۔ کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح روایت کیا ہے۔ تو اس صورت میں تابعی نے صحابی پر ساری ذمہ داری ڈال دی۔ اور جب ذمہ داری دوسرے پر ہوتی ہے۔ تو انسان کو اتنا فکر نہیں ہوتا۔ بلکہ بے پرواہی سے نقل کر دیتا ہے۔ اس لئے مرسل تو کجا منقطع بھی صرف حجت

ہی نہیں بلکہ متصل پر مقدم ہے۔ ملاحظہ ہو نور الانوار بیان اقسام السنہ ص۱۸۵

حنفیہ نے جو کچھ دلیل دی ہے بظاہر تو بڑی آراستہ پیراستہ ہے مگر جب واقعات اس کے خلاف پائے گئے اور بہت تابعین کو دیکھا گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ اور درمیان واسطے کمزور ہوتے ہیں جیسے زہری تابعیؒ وغیرہ کے حالات سے معلوم ہوا تو پھر حنفیہ کی قیاسی دلیل یہاں کیا کر سکتی ہے۔ اور حنفیہ کا یہ ایک اصول نہیں بلکہ اکثر اسی طرح رائے قیاس کے تابع ہوتے ہیں۔ جیسے یہ اصول کہ غیر فقیہ صحابی (مثلاً ان کے نزدیک ابوہریرہؓ اور انسؓ) کی حدیث اگر قیاس کے خلاف ہو تو قیاس کو ترجیح ہوگی۔ اور ایک حدیث کو دوسری حدیث پر کثرت راویوں سے ترجیح نہیں ہوگی۔ اسی طرح کتاب اللہ کے عام حکم کی یا حدیث مشہور کی تخصیص خبر واحد سے نہیں ہو سکتی۔ خواہ بخاری مسلم کی ہو وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس طرح رائے قیاس سے اصول وضع کر کے احادیث کو رد کرتے ہیں۔ اور امام کے مذہب کی پاسداری کرتے ہیں۔ اور ان کا نام اصول اجتہاد رکھتے ہیں۔ ایسے اصولوں کو مہارت حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ فن حدیث سے کوری کی علامت ہے۔ خاص کر جب کہ ایسے اصول وضع کرنے والوں کا زمانہ بھی سلفؒ سے بہت دور ہو۔ تو ایسی حالت میں ان کے اصولوں سے حدیث کی جان پہچان کس طرح ہو سکتی ہے۔ بلکہ صحت وضعف، حجیت، عدم حجیت کا معیار محدثین کے اصول ہیں۔ جو واقعات پر مبنی ہیں۔ خاص کر وہ محدثین جن کا زمانہ قریب کا ہے۔ جیسے اصحاب ستہ اور امام احمدؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام اسحاق بن راہویہؒ، امام علی بن مدینیؒ، امام یحییٰ بن سعیدؒ وغیرہ ان کے اصول اصل اصول ہیں۔ اور انہی کے اصولوں سے احادیث کے صحت وضعف حجیت عدم حجیت کی پڑتال ہوگی۔ اور ان کا احادیث کے صحت وضعف پر حکم لگانا سب پر مقدم ہوگا۔ بلکہ مقدمہ ابن الصلاح میں تو لکھا ہے کہ صحت وضعف کا حکم انہی ائمہ حدیث کا معتبر ہے۔ اس وقت کا اعتبار نہیں۔ مقدمہ ابن الصلاح کی اصل عبارت یہ ہے:۔

اذا وجدنا فیما نروی من اجزاء الحدیث وغیرها حدیثا صحیح الاسناد ولم نجده فی احد الصحیحین ولا منصوصا علی صحته فی شئ من مصنفات ائمة الحدیث المعتمدة المشهورة فانا لا نتجرؤ علی جزم الحکم بصحته فقد تعذر فی هذه الاعصار الاستقلال بادراك الصحیح بمجرد اعتبار الاسانید لانه ما من اسناد من ذلك الا و نجد فی رجاله من اعتمد فی روایته علی ما فی کتابه عریا عما یشترط فی الصحیح من الحفظ والضبط والاتقان قال الامر اذا فی

معرفة الصحيح والحسن الى الاعتماد على ما نص عليه ائمة الحديث فى تصانيفهم المعتمدة المشهورة التى يؤمن فيها لشهرتها من التغيير والتحريف وصار معظم المقصود بما يتداول من الاسانيد خارجاً عن ذالك ابقاء سلسلة الاسناد التى خصت بها هذه الامة زادها الله شرفاً آمين۔

(مقدمہ ابن الصلاح ص۷)

یعنی جن کتب حدیث کے اجزاء کی ہم روایت کرتے ہیں ان میں اگر کسی حدیث کی اسناد ہم صحیح پائیں اور صحیحین سے کسی میں وہ حدیث نہ ہو اور نہ کتب متداولہ معتبرہ مشہورہ میں اس کی صحت کی تصریح ہو تو ہم صرف اسناد صحیح پاکر حدیث کی صحت کا حکم لگانے پر دلیری نہیں کرسکتے کیونکہ ان اسانید سے ہر ایک اسناد میں ایسے راوی ہیں جن کی روایت پر اس کتاب کے موافق اعتماد کرلیا گیا ہے جو شرائط صحت حفظ ضبط اتقان سے خالی ہے پس اب دارومدار صحت اور حسن کا ائمہ حدیث کی تصریحات پر ہوا جو ان کی تصانیف معتبرہ مشہورہ میں پائی جاتی ہیں جو بوجہ شہرت تغییر و تحریف سے محفوظ ہیں۔ اور اسانید متداولہ کا اہم مقصد صحت وضعف سے بے تعلق ہو کر صرف یہ ٹھہرا کہ سلسلہ اسناد جس کے ساتھ اس امت کو خاص کیا گیا ہے قائم رکھا جائے خدائے تعالیٰ اس امت کو شرف میں اور زیادہ کرے۔ ابن الصلاح ۶۴۳ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ جب اس وقت یہ حالت تھی تو اب اس سے بھی معاملہ نازک ہے پس مشہور ائمہ حدیث کی طرف ہمیں زیادہ احتیاج ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ جتنا قرب کا زمانہ ہوگا اور جتنا کوئی فن حدیث میں پیش پیش ہوگا اتنا ہی صحت وضعف اور جرح وتعدیل کے متعلق اس کا قول اولیٰ معتبر ہوگا۔ رائے قیاس والوں کا اس میں دخل ہے نہ اصحاب ستہ کی اس میں تخصیص ہے رائے قیاس والوں کو دخل کرنا افراط ہے اور اصحاب ستہ کی تخصیص تفریط ہے افراط تفریط سے بچنا چاہیئے اور متوسط راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اگر اصحاب ستہ کا کسی حدیث کے صحت وضعف میں اختلاف ہوجائے تو وہاں فیصلہ کی یہی صورت ہے کہ جرح تعدیل پر متقدمین کے اصول پر فیصلہ یہی تو راستہ ہے جو افراط وتفریط سے خالی ہے پس اس کی پابندی چاہیئے۔ واللہ الموفق۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۸ صفر ۱۳۶۹ھ

سجدہ تعظیمی

سوال:۔ سجدۂ تعظیمی غیر اللہ کو یعنی انبیاء اولیاء کو کرنا شرک اکبر ہے یا حرام کبیرہ گناہ ہے؟ اور آدم علیہ السلام

کو جو ملائکہ سے سجدہ کرایا گیا وہ سجدۂ تعظیمی تھا یا تعبدی ؟ اور خدا نے ملائکہ سے سجدہ کیوں کرایا جب کہ اس نے شرک کو کسی شریعت میں جائز نہیں کیا ؟

دوسرے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو سجدۂ تعظیمی کیا تھا۔ قال اللہ تعالیٰ :۔ ورفع ابویہ علی العرش وخروالہ سُجّدًا۔ (سورہ یوسف) اس سے ظاہر ہے کہ شریعت یوسفی تک سجدۂ تعظیمی جائز تھا اگر شرک ہوتا تو کسی شریعت میں جائز نہ ہوتا کیونکہ شرک تمام شرائع انبیاء میں حرام تھا جو لوگ سجدۂ تعظیمی کو شرک اکبر کہتے ہیں۔ وہ اسلام میں غلو کرتے ہیں یا نہیں ؟

جواب :۔ بے شک شرک کفر کسی شریعت میں جائز نہیں مگر اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں مثلاً آدم علیہ السلام کے وقت بہن بھائی میں نکاح جائز تھا۔ اب کوئی شخص جائز کہے تو وہ کافر ہے اور بحکم آیہ کریمہ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ مشرک ہے۔ ٹھیک اسی طرح سجدۂ تعظیمی کہو یا تعبدی کو جب خدا کے حکم سے ہو تو وہ غیر کی عبادت نہیں جب خدا کے حکم کے خلاف ہو تو وہ غیر کی عبادت ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ نیز قرآن شریف میں ہے اَمْ لَھُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَھُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِہِ اللّٰہُ۔ یعنی حکم صرف خدا ہی کے لئے ہے کیا ان کے لئے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین مقرر کیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

قرآن مجید میں ہے :۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ ۝

یعنی سورج چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس ذات کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔

اس آیت میں مطلق سجدہ سے نہی فرمائی ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا ہے کہ اس ذات کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ حکم سورج چاند پہ بند نہیں بلکہ سجدہ خالق کا حق ہے مخلوق کا نہیں خواہ سورج چاند ہو یا کوئی اور مخلوق ہو۔ اور اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ سے مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی سجدہ غیر کو ہو گیا تو پھر خاص خدا کے عابد نہیں ہو گے بلکہ مشرک ہو جاؤ گے۔ اس

کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن مجید میں ہے :-

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ۔ یعنی کہہ دے اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو :

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میرے مقابلہ میں کسی اور کی اتباع کرو گے خواہ کسی طرح سے ہو تو پھر خدائی محبت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آیت بالا کا مطلب سمجھ لینا چاہیئے کہ جب غیر کو سجدہ ہوا خواہ اس کا نام سجدہ تعظیمی رکھو یا کچھ اور، تم خاص خدا کے عابد نہیں رہ سکتے بلکہ مشرک ہو جاؤ گے۔ گویا ہماری شریعت میں سجدہ مطلقاً حرام کر دیا گیا ہے خواہ اس کا نام کوئی کچھ رکھے۔ اور اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

فتاویٰ ابن تیمیہ میں ہے :-

اما تقبیل الارض ووضع الراس ونحو ذلك مما فیه السجود مما یفعل قدام بعض الشیوخ وبعض الملوك فلا یجوز بل لا یجوز الانحناء كالركوع كما قالوا للنبی صلی اللہ علیه وسلم الرجل منا یلقی اخاه اینحنی له قال قال لا. ولما رجع معاذ من الشام سجد للنبی صلی اللہ علیه وسلم فقال ما ھذا یا معاذ قال یا رسول اللہ رأیتهم فی الشام یسجدون لاساقفتهم ویذكرون ذلك عن انبیاءهم فقال كذبوا علیهم لو كنت امرا احداً ان یسجد لاحد لامرت المرأة ان تسجد لزوجها من اجل حقه علیها یا معاذ انه لا ینبغی السجود الا للّٰہ۔ واما فعل ذلك تدینا وتقربًا فهذا من اعظم المنكرات ومن اعتقد مثل هذا قربة ودینا فهو ضال مفتر بل یبین له ان هذا لیس بدین ولا قربة فان اصر علی ذلك استیب والا قتل۔

(فتاویٰ ابن تیمیہؒ جلد اوّل صـــ۳۱ـــ)

یعنی زمین کو بوسہ دینا اور سر زمین پر رکھنا اور مثل اس کے جس میں سجدہ ہے جو بعض مشائخ اور بعض بادشاہوں کے سامنے کیا جاتا ہے یہ جائز نہیں بلکہ جھکنا مثل رکوع کے بھی جائز نہیں۔ چنانچہ صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم سے کوئی اپنے بھائی سے ملتا ہے تو کیا اس کے لئے جھکے؟ تو فرمایا نہ۔ اور جب معاذؓ سفر شام سے واپس آئے تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ فرمایا۔ اے معاذ! یہ کیا؟ کہا میں نے اہل کتاب کو دیکھا کہ وہ اپنے علماء کو سجدہ کرتے ہیں۔ فرمایا یہ جھوٹ ہے۔ اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کرے بوجہ حق اس کے کہ اس پر۔ اے معاذ! سوا خدا کے کسی کے لئے سجدہ لائق نہیں اور دین اور ثواب سمجھ کر سجدہ کرنا بڑے کبائر سے ہے جو اس کا اعتقاد رکھے وہ گمراہ مفتری ہے۔ اس کے لئے بیان کیا جائے کہ یہ دین اور ثواب نہیں اگر اصرار کرے تو اس سے توبہ طلب کی جائے۔ اگر توبہ نہ کرے تو قتل کیا جائے۱؎۔

قریب قریب اسی قسم کی روائتیں مشکوٰۃ باب عشرۃ النساء وغیرہ میں موجود ہیں۔ کہ سجدہ غیر کو جائز نہیں اگر جائز ہوتا تو عورت کو خاوند کے لئے سجدہ کا حکم ہوتا۔ اور مشکوٰۃ کے اسی باب میں آپ کی قبر کو سجدہ کی ممانعت مذکور ہے اور جب آپ کو یا آپ کی قبر کو سجدہ کی اجازت نہیں تو غیر کے لئے کس طرح اجازت ہوگی۔ بلکہ مشکوٰۃ باب القیام میں قیام تعظیمی سے بھی آپ نے منع فرمایا ہے تو سجدہ کس طرح جائز ہوگا؟

خلاصہ یہ کہ نماز کی مشابہت کسی غیر کے لئے جائز نہیں نہ قیام نہ رکوع نہ سجدہ۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کی قبروں میں ممانعت ہے تاکہ عبادت قبور سے مشابہت نہ ہو اور جب مشابہت منع ہے تو حقیقۃً قیام یا رکوع یا سجدہ غیر کے لئے کیونکر جائز ہوگا۔

مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود

سوال:۔ مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی صوفیاء کے نزدیک کیا تعریف ہے؟ اور محققین علماء اس کے کیا معنی مراد لیتے ہیں؟ اور یہ توحید وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی زمانہ سلف میں تھی یا نہیں؟

جواب:۔ مولینا جامیؒ نے اپنی کتاب نفحات الانس من حضرات القدس فارسی کے صفحہ ۲ تا صفحہ ۲۰ میں بحوالہ ترجمۃ العوارف باب اول توحید کے چار مراتب لکھے ہیں۔ اصل عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ کرنے سے تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ اس لئے کسی قدر توضیح کے ساتھ اردو خلاصہ پر اکتفاء کی جاتی ہے جس کو

۱؎ یعنی اگر قتل وغیرہ کے ڈر سے کیا جائے تو وہ اس گناہ میں شامل نہیں بلکہ بعض کے نزدیک جائز ہے۔ ۱۲

زیادہ تفصیل کا شوق ہو وہ اصل کتاب ملاحظہ کرے۔

اوّل توحید ایمانی، دوّم توحید علمی، سوّم توحید حالی، چہارم توحید الٰہی

توحیدِ ایمانی عوام کی توحید ہے یعنی کتاب و سنت کے مطابق، خدا کو وحدہٗ لاشریک سمجھنا اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا۔ دل میں اس کا اعتقاد رکھنا اور زبان سے اقرار کرنا، اور یہ توحید مخبر صادق ﷺ کی خبر کے تصدیق کرنے کا نتیجہ ہے اور ظاہری علم سے حاصل ہے۔ اور صوفیاء کرام اس توحید میں عام مومنوں کے ساتھ شریک ہیں اور باقی قسموں میں ممتاز ہیں۔

توحیدِ علمی باطنی علم سے حاصل ہوتی ہے جس کو علم الیقین کہتے ہیں، اور وہ اس طرح ہوتی ہے کہ انسان کا یقین اس حد تک پہنچ جائے کہ موجود حقیقی اور مؤثر مطلق بجز خدا کسی کو نہ جانے۔ تمام ذوات صفات اور افعال کو خدا کی ذات، صفات اور افعال کے سامنے ہیچ سمجھے۔ ہر ذات کو اس کی ذات کا اثر خیال کرے اور ہر صفت کو اس کی صفت کا پرتو جانے۔ مثلاً جہاں علم، قدرت، ارادہ، سُننا دیکھنا پائے ان سب کو خدا تعالیٰ کے علم، قدرت، ارادہ، سُننے دیکھنے کے آثار سے سمجھے۔ اسی طرح باقی صفات و افعال کو خیال کرے گویا ظاہری اسباب کا پردہ درمیان نہ دیکھے۔ اور سب کچھ مؤثر حقیقی کی طرف سے سمجھے یہاں تک کہ ظاہری اسباب سے متاثر نہ ہو۔ مگر چونکہ اس مرتبہ میں حجاب باقی رہتا ہے اس لئے اکثر اوقات نظر ظاہری اسباب کی طرف چلی جاتی ہے جو شرک خفی کی قسم ہے۔

توحیدِ حالی یہ ہے کہ قریب قریب تمام حجابات درمیان سے اُٹھ جاتے ہیں، اور موحد مشاہدہ جمال وجود واحد کا کرتا ہے جیسے ستاروں کا نور آفتاب کے نور میں غائب ہو جاتا ہے اسی قریب قریب تمام وجودات موحد کی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ توحید کی صفت کو بھی اسی وجود واحد کی صفت دیکھتا ہے اور اپنے مشاہدہ کو بھی اسی وجود واحد کی صفت دیکھتا ہے۔ غرض اس کی نظر میں وحدت ہوتی ہے۔ دوئی کا وہاں دخل نہیں رہتا۔ اس طریق سے موحد کی ہستی، بحر توحید کا ایک قطرہ ہو کر اس میں مضمحل ہو جاتی ہے اور ایسی گھل مل جاتی ہے کہ وہاں انتشار نہیں رہتا۔ اسی بناء پر جنید بغدادیؒ (سرتاج صوفیاؒ) نے کہا ہے:۔

التوحید معنی یضمحل فیہ الرسوم ویندرج فیہ العلوم یکون اللہ کما لم یزل

یعنی توحید ایک معنی ہے جس میں رسمی وجود حقیقی وجود میں گھل مل جاتے ہیں اور علوم اس میں

مندرج ہو جاتے ہیں. گویا خدا ویسے کا ویسا ہے. کوئی چیز پیدا ہی نہیں کی."

یہ توحید مشاہدہ سے پیدا ہوتی ہے اور توحید علمی مراقبہ سے، مراقبہ ظاہر کی طرف سے توجہ ہٹا کر جمال محبوب کی انتظار ہے اور مشاہدہ محبوب کا دیدار ہے. توحید علمی میں اکثر لوازم بشریہ باقی رہتے ہیں اور توحید عالی میں تھوڑے باقی رہتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں ترتیب افعال اور تہذیب اقوال کے ساتھ مکلف ہے اور مکلف اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ لوازم بشریہ رہیں جن کا اس کو مقابلہ کرنا پڑے اسی بناء پر ابو علی دقاق رہ نے کہا ہے۔

التوحید غریم لا یقضی دینه وغریب لا یؤدی حقه۔

"یعنی توحید ایسا قرض خواہ ہے کہ اس کا قرض پورا نہیں ہو سکتا اور ایسا مسافر ہے کہ اس (کی مہمانی) کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔"

دُنیا کی کبھی کبھی خالص حقیقت توحید جس میں یکبارگی آثار اور رسمی وجود گم ہو جاتے ہیں، بجلی کی چمک کی طرح نمودار ہوتی ہے اور فی الفور بجھ جاتی ہے اور رسمی وجودات کا اثر دوبارہ لوٹ آتا ہے اور اس حالت میں شرک خفی کا نام نشان نہیں رہتا. انسان کے لئے توحید میں اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ ممکن نہیں۔

توحیدِ الٰہی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ خود اپنی ذات میں بغیر اس کے کہ دوسرا اس کی طرف وحدت کی نسبت کرے ازل میں ہمیشہ وحدت سے موصوف رہا چنانچہ حدیث میں ہے کان اللہ ولم یکن معه شیئ یعنی خدا تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی دوسری شئے نہ تھی۔ اور اب بھی اسی طرح ہے اور ابدالاباد اسی طرح رہے گا. چنانچہ قرآن مجید میں ہے کل شیئ ھالك الا وجهه. یعنی ہر شئے ہلاکت والی ہے مگر خدا کی ذات." اس آیت میں یہ نہیں کہا کہ ہر شئے ہلاک ہو جائے گی. بلکہ "ہالک" کہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت بھی ہلاکت والی ہے یعنی نیست اور فانی ہے اس کی مثال اس طرح ہے جیسے رسّی جلا دی جائے تو اس کے بٹ بدستور نظر آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ رسّی قائم ہے حالانکہ حقیقت میں رسّی فنا ہو چکی ہوتی ہے اور اس حالت کے مشاہدہ کے لئے قیامت کا حوالہ دینا یہ مجوبوں کے لئے ہے ورنہ ارباب بصیرت اور اصحاب مشاہدہ جو زمان و مکان کے تنگ کوچہ سے گذر کر خلاصی پا گئے یہ وعدہ ان کے حق میں قیامت تک اُدھار نہیں بلکہ نقد ہے یعنی مجوبوں کے لئے جو مشاہدہ قیامت کو ہوگا، ارباب بصیرت کے لئے اس وقت ہو رہا ہے۔

یہ توحیدِ الٰہی نقص و عیب سے بری ہے۔ برخلاف توحیدِ مخلوق کے وہ بوجہ نقص وجود کے ناقص ہے۔

یہ چار قسمیں توحید کی صوفیاء کے ہاں مشہور ہیں۔ اخیر کی دو وہی ہیں جن کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے یعنی توحید حالی وحدۃ الشہود ہے اور توحید الٰہی وحدۃ الوجود ہے۔ یہ اصطلاحات زیادہ تر متاخرین صوفیاً (ابن عربی وغیرہ) کی کتب میں پائی جاتی ہیں۔ متقدمین کی کتب میں نہیں۔ ہاں مراد ان کی صحیح ہے۔ توحید ایمانی اور توحید علمی تو ظاہر ہے توحید حالی کا ذکر اس حدیث میں ہے۔ ”ان تعبد الله کانك تراہ فان لم تكن تراہ فانہ یراك۔ یعنی خدا کی اس طرح عبادت کر گویا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو نہ دیکھے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے“ یہ حالت چونکہ اکثر طور پر ریاضت اور مجاہدہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے یہ عقل سے سمجھنے کی شئے نہیں ہاں اس کی مثال عاشق و معشوق سے دی جاتی ہے۔ عاشق جس پر معشوق کا تخیل اتنا غالب ہوتا ہے کہ تمام اشیاء اس کی نظر میں کالعدم ہوتی ہیں۔ اگر دوسری شئے کا نقشہ اس کے سامنے آتا ہے تو محبوب کا خیال اس کے دیکھنے سے حجاب ہو جاتا ہے گویا ہر جگہ اس کو محبوب ہی محبوب نظر آتا ہے خاص کر خدا کی ذات سے کسی کو عشق ہو جائے تو چونکہ تمام اشیاء اس کے آثار اور صفات کا مظہر ہیں اس لئے خدائی عاشق پر اس حالت کا زیادہ اثر ہوتا ہے یہاں تک کہ ہر شئے سے اس کو خدا نظر آتا ہے وہ شئے نظر نہیں آتی جیسے شیشہ دیکھنے کے وقت چہرے پر نظر پڑتی ہے نہ کہ شیشہ پر۔

شیخ مخدوم علی ہجویریؒ معروف بہ ”داتا گنج بخش“ جن کا لاہور میں مزار مشہور ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ”کشف المحجوب“ باب مشاہدہ میں صوفیاء کے اقوال اس قسم کے بہت لکھے ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے جو بیان ہوا ہے کہ غلبۂ محبت اور کمال یقین کی وجہ سے ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ غیر خدا پر نظر ہی نہیں پڑتی۔ اسی طرح دوسرے بزرگوں نے اپنی تصانیف میں لکھا ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ خواص کی دو حالتیں ہیں جلوت اور خلوت۔ جلوت لوگوں سے اختلاط اور میل جول کی حالت ہے اور خلوت علیحدگی اور تنہائی کی حالت ہے جس میں ظاہراً باطناً خدا کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ جلوت میں تبلیغ کا کام ہوتا ہے اور خلوت میں نفس کی اصلاح اور دل کی صفائی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ مزمل کے شروع میں ان دونوں حالتوں کا بیان ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا

یعنی ”رات کا قیام نفس کے لتاڑنے کے لئے سخت ہے اور زبان کو بہت درست رکھنے والا ہے۔ بے شک تجھے دن میں طویل شغل ہے۔“

ان دونوں آیتوں میں ان دونوں حالتوں کا ذکر ہے جن کی یہ دونوں حالتیں قائم ہیں ان کی توریس ہی نہیں اوّل نمبر ان میں انبیاء علیہم السلام کا ہے پھر درجہ بدرجہ ان کے جانشینوں کا ہے۔ جو لوگ ساری عمر خلوت میں گذارتے ہیں اگرچہ ان کی حالت شاید زیادہ ہوتی ہے مگر چونکہ یہ چیز صرف ان کی ذات سے تعلق رکھتی ہے اس میں متعدی فائدہ نہیں اس لئے وہ علماء ربانیین کا مقابلہ نہیں کر سکتے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی ستاروں پر" اور دوسری حدیث میں ہے۔ جیسی میری تمہارے ادنیٰ پر۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ٢)

پس انسان کو چاہیئے کہ توحید حالی حاصل کرتے ہوئے افضل مرتبہ ہاتھ سے نہ دے۔ جو شخص گوشہ نشینی کو بڑا کمال سمجھے ہوئے ہیں اور اپنی عمر اسی میں گذار دیتے ہیں وہ علمائے ربانی کی نسبت بڑے خسارہ میں ہیں۔ اگرچہ ذاتی طور پر ان کی طبیعت کو اطمینان و سکون زیادہ ہو۔ اور ذوقِ عبادت اور حلاوتِ ذکر میں خواہ کتنے بڑھے ہوئے ہوں مگر علمائے ربانی کا متعدی فائدہ اس سے بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ شیطان کا اصل مقابلہ کرنے والی یہی (علمائے ربانی) کی جماعت ہے۔ عابد ریاضت اور مجاہدہ سے صرف اپنی خواہشات کو دبا تا ہے اور یہ جماعت ہزاروں کی اصلاح کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"ہزار عابد سے شیطان اتنا نہیں ڈرتا جتنا ایک عالم سے ڈرتا ہے" (مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ٢)

خدا ہمیں بھی ربانی علماء کرے اور انہی کے زمرہ میں اُٹھائے   آمین

اب رہی توحید الٰہی سو اس کے متعلق بہت دنیا بھکی ہوئی ہے۔ بعض تو اس کا مطلب "ہمہ اوست" سمجھتے ہیں یعنی ہر شئے عین خدا ہے۔ جیسے برف اور پانی بظاہر دو معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت ایک ہے اسی طرح خدا اور دیگر موجودات ہیں بعض کہتے ہیں کہ یہ تمام موجودات وحدتِ حقیقی کا عکس ہیں جیسے ایک شخص کے ارد گرد کئی شیشے رکھ دیئے جائیں تو سب میں اس کا عکس پڑتا ہے ایسے ہی خدا اصل ہے اور باقی اشیاء اس کا عکس ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ کلی جزئی کی مثال ہے جیسے انسان اور زید عمر بکر ہیں حقیقت سب کی ایک ہے اور یہ تعیّنات حوادث ہیں۔ غرض دُنیا عجیب گورکھ دھندے میں پڑی ہوئی ہے کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔

صحیح راستہ اس میں یہ ہے کہ اگر اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ سوا خدا کے کوئی شئے حقیقۃً موجود نہیں اور یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ محض توہمات ہیں جیسے "سوفسطائیہ" فرقہ کہتا ہے کہ آگ کی گرمی اور پانی کی برودت وہمی اور خیالی چیز ہے تو یہ سراسر گمراہی ہے۔ اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ موجودات انسانی ایجادات کی طرح نہیں

کہ انسان کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں بلکہ یہ ان کا وجود خدا کے سہارے پر ہے اگر اُدھر سے قطع تعلق فرض کیا جائے تو ان کا کوئی وجود نہیں، تو یہ مطلب صحیح ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے بجلی کا کرنٹ (برقی رو) قمقموں کے لئے ہے۔ گویا حقیقت میں اس وقت بھی ہر شئے فانی ہے مگر ایک علمی رنگ میں اس کو سمجھنا ہے اور ایک حقیقت کا سامنے آنا ہے۔ علمی رنگ میں تو سمجھنے والے بہت ہیں مگر حقیقت کا اس طرح سامنے آنا جیسے آنکھوں سے کوئی شے دیکھی جاتی ہے یہ خاص ارباب بصیرت کا حصّہ ہے گویا قیامت والی فنا اس وقت ان کے سامنے ہے۔ پس آیہ کریمہ کل شئ ھالك الا وجهه۔ ان کے حق میں نقد ہے نہ اُدھار۔

نوٹ:۔ ابن عربیؒ، رومیؒ اور جامیؒ وغیرہ کے کلمات اس توحید میں مشتبہ ہیں، اس لئے بعض لوگ ان کے حق میں اچھا اعتقاد رکھتے ہیں بعض بُرا۔ ابن تیمیہؒ وغیرہ ابن عربیؒ سے بہت بدظن ہیں۔ اسی طرح رومیؒ اور جامیؒ کو کئی علماء بُرا کہتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ جب ان کا کلام محتمل ہے جیسے جامیؒ کا کلام اُوپر نقل ہو چکا ہے اور وہ درحقیقت ابن عربیؒ کا ہے۔ کیونکہ ابن عربی کی کتاب "عوارف المعارف" سے ماخوذ ہے تو پھر ان کے حق میں سُوءِ ظنی ٹھیک نہیں۔ اسی طرح رومیؒ کو خیال کر لینا چاہیئے۔ غرض حتی الوسع فتویٰ میں احتیاط چاہیئے جب تک پُوری تسلی نہ ہو فتویٰ نہ لگانا چاہیئے خاص کر جب وہ گذر چکے، اور ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہو چکا تو اب کرید کی کیا ضرورت؟ بلکہ صرف اس آیت پر کفایت کرنی چاہیئے۔

تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون

نوٹ:۔ ابن عربیؒ وغیرہ کا کچھ ذکر "تنظیم" جلد ۹ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۰ء مطابق ۲۰ صفر المظفر ۱۳۵۹ھ میں بھی ہو چکا ہے اور رسالہ "تعریف اہلسنت" کے صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۶ میں بھی ہم اس کے متعلق کافی لکھ چکے ہیں زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو وہاں ملاحظہ ہو۔ [1]

انبیاء اولیاء سے بعد وفات فیوضاتِ روحانی

سوال:۔ انبیاء اولیاء سے بعد وفات فیوضاتِ روحانی حاصل ہوتے ہیں یا نہیں؟ بہت مرتبہ خوابات کے ذریعہ اہل اللہ نے فیوضِ روحانی پہنچائے ہیں۔ اور کیا اس کا انکار ایک تواتر کا انکار ہے؟ اور کیا اس کا امکان شرعاً ہو سکتا ہے؟ اموات کے لئے سماع وادراک احادیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب:۔ فیض روحانی جس کے اہل بدعت قائل ہیں کہ ان سے استمداد وغیرہ کی جائے یہ غلط ہے ہاں خوابات

[1] محدث روپڑیؒ کی اچھی رائے ہے ورنہ بعض علماء نے اعتقاد کی بنا پر ابن عربی کو کافر کہا ہے۔ (م)

میں ملاقات سے انکار نہیں۔ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوتی ہے۔ مسائل بھی دریافت کرلئے جاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے بزرگ بھی ملتے ہیں مگر یہ شئے اختیاری نہیں۔ جب خدا چاہتا ہے ایسا ہو جاتا ہے۔ جیسے عام طور پر خوابوں کی حالت ہے۔ ——— اور بعض دفعہ شیطانی دھوکے بھی ہوتے ہیں اس لئے یہ کوئی پوری اعتماد والی شئے نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں اگرچہ شیطان نہیں بن سکتا مگر پورا حلیہ کس کو محفوظ ہوتا ہے کہ وہ تمیز کر سکے اور اگر شاذونادر کسی کو محفوظ ہو اور اس کو پوری تسلی ہو جائے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو پھر اعتماد ہو سکتا ہے مگر خدا جن کو یہ درجہ دیتا ہے وہ عموماً اپنی حالت کو چھپاتے ہیں۔ اس لئے عام دعویٰ کرنے والوں کے دھوکہ میں نہ آنا چاہیئے

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۷ صفر ۱۳۵۹ھ مطابق ۵ مارچ ۱۹۴۰ء

شیاطین کا جکڑے جانا اور ستاروں کا ٹوٹنا

سوال:۔ قرآن شریف میں آتا ہے کہ تارے شیطانوں کے لئے راجم ہیں جو اُن سے مارے جاتے ہیں اور حدیث میں آتا ہے کہ رمضان میں سب شیطان قید کئے جاتے ہیں۔ مگر تارے اسی طرح بدستور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ان کے ٹوٹنے کی وجہ بیان کی جائے؟

اللہ دین چک ۱۴/۱۰-R ڈاکخانہ خاص ضلع منٹگمری

جواب:۔ حدیث میں ہے سرکش شیطان جکڑے جاتے ہیں، سارے نہیں ملاحظہ ہو مشکوٰۃ کتاب الصوم پس اب کوئی اعتراض نہیں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ ۱۷ محرم الحرام ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء

استخارہ اور الہام

سوال:۔ الہام اور استخارہ میں کیا فرق ہے اور یہ دونوں دلیل ظنی ہیں یا یقینی اور ان کی بناء پر کسی شخص کے متعلق نیک یا بد کا حکم لگانا کس طرح ہے؟ سائل فتح دین

جواب:۔ جو استخارہ سے معلوم ہوتا ہے وہ بیداری میں ہو تو الہام ہی ہے اور غیر نبی کا الہام دلیل ظنی ہے اور اس میں شیطان کا دخل بھی ممکن ہے اس لئے شریعت کے خلاف ہو تو معتبر نہیں اور کسی پر نیک بد کا

حکم بھی اسی درجہ کا ہوگا جس درجہ کا الہام ہے اگر کسی کامل بزرگ کا ہے تو وہ زیادہ قابل اعتماد ہے ورنہ معمولی ہے۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء

مُباہلہ

سوال:- کیا مباہلہ میں اس کے نتیجہ کے لئے مدت مقرر کرنی جائز ہے اور کیا نتیجہ وہ معتدبہ ہے جو مدت مقررہ کے دوران میں واقع ہو؟

جواب:- روایات مباہلہ جو آیت مباہلہ کے تحت مفسرین نے ذکر کی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ ایک سال مدت مفہوم ہوتی ہے اور جب مدت مقرر ہو جائے تو معتدبہ نتیجہ بھی وہی ہے جو اس مدت کے اندر ہو اور اگر مدت گزر کر کوئی نتیجہ نکلے تو اس میں یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اتفاقیہ ہے کیونکہ اتفاقات سے بھی دُنیا خالی نہیں ہے اگر خدا کو اس سے صداقت کا اظہار مقصود ہوتا تو وہ مدت مقررہ میں اس کو ظاہر کر سکتا تھا۔

سوال:- کیا فریق کاذب کے تمام مباہلین کی ہلاکت ضروری ہے یا بعض کی؟ اور اگر فریق صادق سے چند آدمی جو فریق مخالف کے ہلاک شدگان سے کم ہوں ہلاک ہو جائیں تو کیا یہ ضروری بات تو نہیں؟

ابو سعید عبدالرحیم مدرسہ شمسیہ عربیہ ویرووال

جواب:- دراصل قطعی طور پر فیصلہ کن مباہلہ نبی کا ہوتا ہے اس کے بعد درجہ بدرجہ جیسے کوئی صاحب کمال ہو اس کا مباہلہ صدق کذب کا معیار بن سکتا ہے۔ عوام کے مباہلہ کا چنداں اعتبار نہیں، کیونکہ مباہلہ دربار الٰہی میں ذمہ داری کی حاضری ہے۔ اور جس کی اپنی عملی حالت پست ہو وہ خدا کے ہاں ذمہ داری کا اہل نہیں کہ خدا اس کی رعایت کرتا ہو؟ دین جیسی اہم شے کو اس سے وابستہ کر دے۔

عبداللہ امرتسری ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ

کچا حمل

سوال:- جو روح داخل ہونے سے پہلے ساقط ہو جاتے ہیں۔ ان کا روح پیدا کیا گیا ہے یا نہیں اور وہ روز حساب زندہ ہو کر جنت یا دوزخ میں جائیں گے یا نہیں؟ اگر ان کا روح پیدا کیا گیا تو جسم طفل جو بعض دفعہ قریب قریب پورا ہو چکا ہوتا ہے اس کے اندر پیدا کرنے سے کیا فائدہ

اور کیا وہ اکارت جائے گا؟ خاکسار محمد خریدار تنظیم ۱۸۴۷

جواب: اس کا جواب قرآن مجید نے دیدیا ہے۔

وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ.

ترجمہ: ہم ان کو نعمتوں اور مصیبتوں سے آزماتے ہیں تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔

سمعلونا کا دم

سوال: سمعلونا کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ درد دانت والے کو اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے۔ اس کو پڑھ کر دم نہیں کیا جاتا بلکہ یا سمعلونا لکھ کر اس پر کیل گاڑے جاتے ہیں؟ محمد سائل

جواب: یہ لفظ اسماعیل کے لفظ سے مشابہ ہے جو عبرانی ہے تو زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اسماعیل کے معنی مطیع اللہ کے ہیں۔ اس کے معنی بھی اسی قسم کے ہیں کسی بزرگ کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کا دم جائز نہیں۔ عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ مطابق ۸ فروری ۱۹۳۹ء

خدا کا مخلوق کی قسم کھانا

سوال: خداوند عالم قرآن شریف میں جگہ جگہ اپنی ذات یا دن رات وغیرہ کی قسم کھاتا ہے مگر اپنی مخلوق کو اپنے اور اپنی صفات کے سوا اوروں کی قسم کھانے سے منع کا ارشاد فرماتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

محمد عبداللہ چک ۴۶۳ گ ب تحصیل سمندری ضلع لائل پور

جواب: ہم غیر اللہ کی قسم کھائیں تو غیر اللہ کی تعظیم کا شبہ ہوتا ہے۔ جو عبادت کی قسم سے ہے اس لئے ہمارے لئے منع ہے اور خدا کے قسم کھانے سے اس تعظیم کا شبہ نہیں ہوتا کیونکہ خدا ہر شے کا خالق ہے اور ہر شے اس کی محتاج ہے اور محتاج غیر محتاج کی تعظیم کیا کرتا ہے نہ کہ غیر محتاج محتاج کی لہٰذا خدا پر یہ شبہ نہیں آسکتا مثلاً ایک آدمی دوسرے آدمی کے پیر چوم لے تو اس پر تعظیم کا شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر ماں بچے کے پیر چوم لے تو یہ تعظیم نہیں سمجھی جا سکتی ٹھیک اسی طرح خدا اور مخلوق کو سمجھ لینا چاہیے۔ تفصیل کیلئے اقسام القرآن حافظ ابن قیمؒ ملاحظہ ہو۔

نیکی کا معیار

سوال:۔ عمرو زید سے سوال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اطمینان دلانے کیلئے دنیائے فانی میں نیکی کا کچھ معیار مقرر کیا ہے یا نہیں اگر کیا ہے تو کس مقدار پر؟ سائل مذکور

جواب:۔ اگر ضروری احکام شرعیہ کی ادائیگی تسلی بخش ہو تو یہ چیز قابل اطمینان ہے اور کوئی چیز نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی لاہور ۱۷ اگست ۱۹۶۲ء

کرامات و عملیات میں فرق

سوال:۔ ایک پیر نے کہا کبھی میرے آباؤ اجداد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے چلے آئے ہیں یہ کیسا ہے؟ نیز کرامات و عملیات میں کیا فرق ہے؟

جواب:۔ اس قسم کا دیکھنا بیداری میں تو کہیں رہا خواب میں بھی خدا کی طرف سے نہیں ہوتا خیر قرون میں اور بعد میں بہتیرے بزرگ گزرے ہیں۔ مگر کبھی کسی کو مقررہ طور پر ہمیشہ اس طرح خواب نہیں آیا۔ یہاں تک کہ موروثی ہو گیا ہو بلکہ بغیر موروثی ہونے کے بھی اس طرح نہیں آیا۔ ہاں لوگوں کے چلے اور عملیات ایسے ہو سکتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۴۹ میں ایک ایسی حدیث ذکر ہوئی ہے۔ ہشام بن عاص اموی کہتے ہیں کہ میں اور ایک شخص اور ابو بکرؓ کی طرف سے ان کی خلافت کے دنوں میں ہرقل بادشاہ روم کے پاس قاصد ہو کر گئے تو اس دربار میں زبان سے کلمہ "لا الہ الا اللہ واللہ اکبر" نکلا۔ یہ کلمہ نکلتے ہی وہ محل اس طرح ہلنے لگا۔ جیسے آندھی سے درخت ہلتا ہے دو دو مرتبہ اسی طرح ہوا۔ ہرقل نے کہا اپنے گھروں میں جب تم یہ کلمہ پڑھتے ہو ہمیشہ اس طرح ہوتا ہے کہا نہیں۔ کہنے لگا۔ اگر تمہارے میں ہمیشہ ایسا ہوتا تو میں اپنا نصف ملک (خوشی میں) لٹا دیتا۔ ہم نے کہا کیوں؟ کہا اگر ایسا ہوتا تو یہ نبوت کا اثر نہ ہوتا بلکہ لوگوں کے حیلوں اور عملیات کی قسم سے ہوتا (جس کا مجھے خطرہ نہ تھا) —— دیکھئے اہل کتاب بھی اس بات سے واقف تھے کہ جو باتیں خدا کی طرف سے بندے کی بزرگی اور کرامت کے اظہار کے لئے ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ اتفاقی ہوتی ہیں۔ چنانچہ صحابہؓ وغیرہم کے حالات سے ظاہر ہے۔ موروثی طور پر خواب کا چلے آنا یہ عملیات کی قسم سے ہے پھر اعتبار نہیں۔ کہ کہنے والا پیر سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ اگر سچ کہتا ہے تو اس کا کیا پتہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی شکل ہے یا کسی اور کی۔ عبداللہ قریشی مقیم روپڑ ضلع انبالہ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۳۲ء

عرش کو کتنے فرشتوں نے اٹھایا ہوا ہے؟

سوال:۔ سورہ حاقہ میں آیا ہے وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَة۔ مستدرک حاکم میں صحیح سند سے آیا ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کا عرش چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور قیامت کے دن چار بڑھا کر آٹھ فرشتے اٹھائیں گے اور ابن جریر میں ابو زید سے مرفوعاً روایت ہے يحمله اليوم يوم القيمة ثمانية (حاشیہ جامع ص۴۵۴) اور ابو داؤد مع عون المعبود ص۳۲۹ میں ہے ثم فوق ذالك ثمانية اوعال بين اظلافهم وركبهم مثل مابين سماء الى سماء ثم على ظهورهم العرش

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش اب آٹھ فرشتوں کی پشت پر ہے اور پہلی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ دونوں کی تطبیق کیا ہے؟

عبداللہ از کھیپانوالی ڈاک خانہ مکستر ضلع فیروز پور

جواب:۔ ابو داؤد کی حدیث میں یہ تصریح نہیں کہ آٹھ فرشتوں کی پیٹھ پر عرش ہے مگر جب دوسری صحیح روایتوں میں چار کی تصریح ہے تو ضمیر سے مراد بعض ہوں گے پس اب کوئی مخالفت نہیں۔

عبداللہ امرتسری مورخہ ۱۱ شعبان ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء

لوح محفوظ

سوال:۔ لوح محفوظ کون سے آسمان پر ہے اور کس چیز کی بنی ہوئی ہے۔ عرش عظیم کے اوپر ہے یا نیچے ہے؟

ایک خریدار تنظیم

جواب:۔ بخاری باب قول اللہ تعالیٰ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ" میں ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ كِتَابًا عِنْدَهُ غَلَبَتْ أَوْ قَالَ سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي وَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ.

یعنی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تو ایک کتاب لکھی کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی وہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش کے اُوپر ہے۔

فتح الباری میں اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

وَالْعَرْشُ مِنْهُ اِشَارَةٌ اِلٰی اَنَّ اللَّوْحَ الْمَحْفُوْظَ فَوْقَ الْعَرْشِ (فتح الباری جزء ۱۳ صفحہ ۴۹۵)

یعنی اس حدیث سے امام بخاری رحؒ کی غرض یہ ہے کہ یہ کتاب لوح محفوظ ہے اور عرش کے اُوپر ہے

تفسیر ابن کثیر میں ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ لوح محفوظ سفید موتی ہے جس کا طول آسمان وزمین کے فاصلے کے برابر ہے اور عرض مشرق اور مغرب کے فاصلے برابر ہے اس کے کنارے موتی اور یاقوت کے ہیں۔ اس کے پٹھے رنگتے (کے ساتھ بند ہے اور اس کا اصل فرشتہ کے آگے ہے۔ مقاتل رحؒ سے روایت ہے کہ عرش کے دائیں طرف ہے ابن عباس رضؓ سے مرفوع روایت ہے کہ لوح محفوظ سفید موتی کی ہے اس کے صفحات سُرخ یاقوت کے ہیں۔ اس کا قلم اور اس کا نوشتہ نور ہے ہر دن اللہ تعالیٰ اس میں چھتیس مرتبہ نظر کرتا ہے۔ کسی کو پیدا کرتا ہے۔ کسی کو رزق دیتا ہے۔ کسی کو مارتا ہے کسی کو زندہ کرتا ہے۔ کسی کو عزت دیتا ہے کسی کو ذلت۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۵۰۱ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۲۷۱

عبد اللہ امرتسری روپڑ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ مطابق ۹ اگست ۱۹۳۴ء

معصُوم بچوں کو تکلیف کی وجہ

سوال:۔ چھوٹے بچوں کو بیماری ام الصبیان وغیرہ کیوں آتی ہے؟

خریدار عظیم نمبر خریداری ۱۸۲۲

جواب:۔ دُنیا میں بیماریوں اور تکلیفوں کا سلسلہ غیر معصوموں کے ساتھ خاص نہیں۔ چھوٹے بچے کیا حیوانات میں بھی جاری ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی ان کی تکلیف دوسرے کی تکلیف کا باعث ہوتی ہے جیسے بچے یا مویشی کی تکلیف ماں باپ یا مالکوں کی تکلیف ہے اور کبھی ایک کی تکلیف دوسرے کی عبرت کا باعث بنتی ہے۔ اور بعض دفعہ اور فوائد بھی مدنظر ہوتے ہیں۔ جیسے انبیاء علیہ السلام اور نیک بندوں پر امتحانات آتے ہیں۔ تاکہ خدا کے محبوب ہونے کی وجہ سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ان کو خدائی اختیارات مل

گئے۔ نیز ان کی حالت دیکھ کر یہ سبق ملتا ہے کہ دُنیا آرام کا گھر نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو خدا کے پیارے یا معصوم اس کے زیادہ اہل تھے۔ بعض دفعہ کوئی دوسرے اعمال سے ایک درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ خدا مصیبت کے ذریعہ اس کو بڑے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں صراحتہً آیا ہے۔ اسی طرح معصوموں کو بھی مصیبت کے عوض کچھ نہ کچھ ملے گا۔ بکریاں آپس میں بھڑ جائیں تو حدیث میں ان کے متعلق انصاف کا ذکر آیا ہے کہ جس نے زیادتی کی ہے۔ اس سے دوسری کو بدلہ دیا جائے گا۔ اگر ماں باپ کی شامت اعمال بچہ کی تکلیف کا باعث بنی ہے تو ماں باپ کی نیکیوں میں ضرور کمی ہوگی اور بچہ کا درجہ اس سے بلند ہوگا یا خُدا اپنے پاس سے بچے کو راضی کر دے گا۔

بہر صُورت دنیا تکلیف کا گھر ہے اس میں دانہ دُنکہ کی طرح جو آیا چکی میں پس گیا اگر اور تکالیف سے بچ گیا تو موت کے گھاٹ ضرور اترے گا۔ جو اس دار تکلیف کی آخری گھاٹی ہے بلکہ انسان کا دُنیا میں داخل ہونا ہی بڑی مصیبت کے ساتھ ہے ماں کو دردِ زِہ کی اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی بچہ کو ہوتی ہے کیونکہ بچہ کا وجود ماں سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ غرض دُنیا میں امتیاز نہیں اس لئے ایک دوسرا دن مقرر ہے۔ جس کا نام قیامت ہے اس دن امتیاز بھی ہوگا اور انصاف بھی۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ ۱۲ شعبان ۱۳۵۵ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء

ہبوطِ آدم

سوال:۔ کیا آدم علیہ السلام بوجہ خطا کرنے کے آسمان سے اتارے گئے تھے یا زمین پر کسی باغ میں تھے؟

ابو سعید عبدالرحیم متعلم شمسیہ عربیہ دیروال ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء

جواب:۔ مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ میدان حشر میں اوّلین و آخرین جب آدم علیہ السلام کے پاس آکر شفاعت کی درخواست کریں گے اور کہیں گے کہ ہمارے لئے جنّت کا دروازہ کھلوائیے۔ تو آدم علیہ السلام عذر کریں گے۔ کہ میرے ہی گناہ نے تو تمہیں جنّت سے نکالا ہے تو اب میں دخول جنّت کے لئے کس طرح سفارش کر سکتا ہوں۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آدم علیہ السلام اسی جنّت میں تھے جس میں اہل ایمان جانے والے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے ولکم فی الارض مستقر یعنی جنّت سے اترنے کا حکم دیکر فرمایا کہ تمہارا زمین

میں ٹھکانا ہے۔ یہ آیت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آدم علیہ السلام اسی جنت میں تھے اگر پہلے ہی سے زمین پر ہوتے تو یوں کہتے ولکم فی موضع آخر مستقر یعنی تمہارا ٹھکانا اب دوسری جگہ ہے۔ اہل سنت کا بھی یہی مذہب ہے کہ آدم علیہما السلام اسی جنت میں تھے معتزلہ ایک گمراہ فرقہ گزرا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام جس جنت میں تھے وہ زمین پر کوئی باغ تھا۔ اور اب نیچریوں مرزائیوں کا بھی یہی خیال ہے۔

عبداللہ امرتسری ۴ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء

حضرت آدمؑ کا حضرت داؤدؑ کو زندگی کا کچھ حصہ دیکر انکار کرنا جھوٹ ہے یا نہیں؟

سوال:۔ حدیث ابوہریرہؓ میں آیا ہے کہ عالم ازل میں جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو اس کی اولاد بھی اس سے پیدا کی۔ اور ان کو نور دیا۔ آدم علیہ السلام نے جب حضرت داؤدؑ کا نور دیکھا۔ تو اپنی عمر ہزار برس سے چالیس برس انکو دے دیئے۔ اور فرمایا رَبِّ زِدْہُ مِنْ عُمُرِیْ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً۔ مگر بعد میں آدم نے عمر دینے سے انکار کر دیا۔ فجحد آدم فجحدت ذریتہ الحدیث رواہ الترمذی (مشکوٰۃ باب القدر صـ۲۳) اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آدمؑ نے باوجود نبی ہو کر اپنی عمر چالیس برس دینے سے دیدہ دانستہ کیسے انکار کر دیا۔ حالانکہ فرشتہ نے بھی یاد دلایا۔ انبیاء علیہ السلام تو کذب بیانی سے منزہ اور معصوم عن الخطاء ہیں۔ اور اس حدیث سے آدم علیہ السلام کی کذب بیانی تو صریح ظاہر ہے۔ اس کا معقول جواب دیں۔

جواب:۔ دینے سے انکار جھوٹ نہیں۔ ہاں اگر یوں کہتے کہ میں نے دینے کو کہا ہی نہیں۔ تب جھوٹ ہوتا۔ جحد سے مراد یہاں دینے سے انکار ہے کہ میں نہیں دیتا اس سے یہ مسئلہ نکلا کہ اولاد کو کوئی شے دے کر واپس لے سکتا ہے۔

اور اگر جحد سے مراد یہ ہو کہ میں نے دینے کو کہا ہی نہیں۔ تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میری یادداشت میں۔ اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ دوسرے کے یاد دلانے سے بات یاد آجائے۔ رہی یہ بات کہ پھر عملدرآمد کیا ہوا۔ تو اس صورت میں اس کا حدیث مذکور میں کوئی ذکر نہیں۔ ممکن ہے کہ فرشتہ کے یاد دلانے سے دینا منظور کر لیا ہو اور ممکن ہے نہ کیا ہو۔

عبداللہ روپڑی ۲۰ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

تبلیغ کی حد

سوال: تبلیغ کس حد تک ہونی چاہیئے؟

جواب: تبلیغ کی حد استطاعت ہے جتنی طاقت ہو کرے جن قوموں کو دعوت پہنچی ہے ان کو تبلیغ ضروری نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کئی قوموں پر شبخون کرتے اور اس وقت تبلیغ نہ کرتے۔

عبداللہ امرتسری یکم رمضان ۱۳۵۹ھ

رفیق اللہ تعالیٰ کا نام ہے

سوال: کیا رفیق اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ کیا عبدالرفیق نام رکھنا درست ہے؟

محمد عبداللہ امام مسجد اہل حدیث چک نمبر ۱ نہر فتح ڈاک خانہ چک نمبر ۱۴۰

تو بہ جمال جیوا ریاست بہاول پور

جواب: مشکوٰۃ شریف میں ہے۔ عَنْ عَائِشَۃَ رض اِسْتَأْذَنَ رَھْطٌ مِّنَ الْیَھُوْدِ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ فَقُلْتُ عَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَۃُ فَقَالَ یَا عَائِشَۃُ اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُّحِبُّ الرِّفْقَ فِی الْاَمْرِ کُلِّہٖ قُلْتُ اَوَلَمْ تَسْمَعْ مَا قَالُوْا قَالَ قَدْ قُلْتُ وَعَلَیْکُمْ وَفِیْ رِوَایَۃٍ عَلَیْکُمْ وَلَمْ یَذْکُرِ الْوَاوَ (متفق علیہ)

(مشکوٰۃ باب السلام فصل اول ص ۳۹۸)

عائشہ رض فرماتی ہیں۔ ایک جماعت یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت مانگی۔ آپ کے پاس آکر السلام علیکم بجائے السام علیکم کہا جس کے معنی ہیں تم پر موت ہو۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں۔ میں نے کہا تم پر موت ہو اور لعنت ہو۔ آپ نے فرمایا اے عائشہؓ بے شک اللہ رفیق ہے ہر امر میں نرمی کو دوست رکھتا ہے میں نے کہا کہ آپ نے سنا نہیں۔ انہوں نے کیا کہا؟ فرمایا جواب میں وعلیکم یا علیکم کہہ دیا ہے جس کے معنی ہیں تم پر بھی موت ہو یہ ہم پر نہیں تم پر ہو۔ بخاری مسلم نے اس کو روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رفیق اللہ پر بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر اگر کوئی عبدالرفیق نام رکھے تو منع نہیں

ہاں بہتر ہے کہ نہ رکھے کیونکہ رفیق کا لفظ ایک جنس کے دو ساتھیوں پر بہت بولا جاتا ہے جس سے عبودیت غیر کا زیادہ خیال آتا ہے افضل یہ ہے کہ مشہور ناموں پر کفایت کرے۔

عبداللہ روپڑی ۱۰ر شعبان ۱۳۵۹ھ ۲۱ر ستمبر ۱۹۴۰ء

غیبت کی حقیقت

سوال : غیبت کرنی تو بڑا گناہ ہے۔ مگر ہم یہ نہ سمجھے کہ غیبت کسے کہا جاتا ہے مثلاً ایک بھائی اپنے حقیقی بھائی یا رشتہ دار کی دینی یا دنیاوی غلطی اپنے کسی دوست سے بیان کرتا ہے کہ اس نے یہ کیا وہ کیا یہ کہا وہ کہا۔ ایسا ہے ویسا ہے کیا یہ غیبت میں شمار ہے یا نہیں واقعہ بھی صحیح ہو، اگر غیبت ہے تو کوئی صورت جو جائز ہو بیان فرمائیں یا منع فرمائیں۔ تاکہ اس سے پرہیز کیا جائے۔

حکیم محمد حسین چک ۴۶ اے۔ ایل ضلع منٹگمری

جواب : مشکوٰۃ میں ہے۔ (اول) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِیْبَةُ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ذِکْرُكَ اَخَاكَ بِمَا یَکْرَهُ قِیْلَ اَفَرَاَیْتَ اِنْ کَانَ فِیْ اَخِیْ مَا اَقُوْلُ قَالَ اِنْ کَانَ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ رواہ مسلم وفی روایة اذا قلت لاخیك ما فیه فقد اغتبته واذا قلت ما لیس فیه فقد بهته (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان والغیبة۔ الخ)

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ کیا جانتے ہو غیبت کسے کہتے ہیں ؟ صحابہؓ نے عرض کیا، اللہ اور رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا غیبت یہ ہے کہ اپنے بھائی کے متعلق تو وہ بات ذکر کرے جس کو وہ برا سمجھے۔ کسی نے کہا اگر وہ بات اس میں موجود ہو فرمایا یہی تو غیبت ہے اگر وہ بات جو تو کہتا ہے تیرے بھائی میں نہ ہو تو یہ بہتان ہے۔"

(دوم) عَنْ عَائِشَةَ رض قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَسْبُكَ مِنْ صَفِیَّةَ کَذَا وَکَذَا تَعْنِیْ قَصِیْرَةً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ کَلِمَةً لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ

رواہ احمد والترمذی وابوداؤد (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان والغیبۃ الخ)
حضرت عائشہؓ کہتی ہیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا (آپ کی بیوی) صفیہؓ (اگرچہ شکل کی اچھی ہے مگر اس) میں اتنا ہی عیب کافی ہے کہ قد کی چھوٹی ہے۔ فرمایا (اے عائشہؓ) تو نے ایسا کلمہ کہہ دیا کہ سمندر میں ملا دیا جائے تو اس پر غالب آجائے۔

(سوم) عن ابی سلمۃ عن فاطمۃ بنت قیس ان اباعمرو بن حفص طلقها البتۃ وهو غائب فارسل الیها وکیلہ الشعیر فسخطتہ فقال واللہ مالک علینا من شئ فجاءت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت ذلک لہ فقال لیس لک نفقۃ فامرها ان تعتد فی بیت ام شریک ثم قال تلک امرأۃ یغشاها اصحابی اعتدی عند ابن ام مکتوم فانہ رجل اعمی تضعین ثیابک فاذا حللت فاذنینی قالت فلما حللت ذکرت لہ ان معاویۃ بن ابی سفیان وابا جهم خطبانی فقال اما ابو الجهم فلا یضع عصاہ عن عاتقہ واما معاویۃ فصعلوک لا مال لہ انکحی اسامۃ بن زید فکرهتہ ثم قال انکحی اسامۃ فنکحتہ فجعل اللہ فیہ خیرًا واغتبطتُ وفی روایۃ عنها فاما ابو جهم فرجل ضراب للنساء رواہ مسلم وفی روایۃ ان زوجها طلقها ثلاثًا فاتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال لا نفقۃ لک الا ان تکونی حاملًا (مشکوٰۃ باب العدۃ فصل اوّل)

(ابوسلمہؓ) فاطمہ بنت قیسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اس کے خاوند عمرو بن حفصؓ نے اس کو بتہ (فیصلہ کن) طلاق دیدی، اور وہ غیر حاضر تھا۔ اس کے وکیل نے نفقہ کے لئے جو بھیجے۔ فاطمہ ناراض ہوگئی، وکیل نے کہا خدا کی قسم! تیرا ہمارے ذمہ کوئی حق نہیں (وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی آپؐ نے فرمایا، تیرے لئے نفقہ کا کوئی حق نہیں، پھر آپؐ نے فاطمہؓ کو ام شریک کے گھر عدت بیٹھنے کا حکم دیا، پھر فرمایا کہ ام شریک کے گھر میرے صحابہؓ کی آمدورفت ہے تو ابن ام مکتومؓ کے گھر عدت بیٹھ، وہ نابینا ہے تو کپڑے اُتار سکے گی جب تیری عدت پوری ہو جائے تو مجھے اطلاع دے۔ فاطمہ کہتی ہے جب میری عدت پوری ہوگئی تو میں نے آپؐ کے پاس ذکر کیا کہ معاویہ بن ابی سفیان اور ابوجہمؓ نے نکاح کی خواہش کی ہے۔ فرمایا ابوجہم تو اپنی لاٹھی کندھے

سے نہیں رکھتا اور معاویہؓ غریب ہے اس کے پاس مال نہیں تو اسامہ بن زیدؓ سے نکاح کرے میں نے اس کو مکروہ جانا۔ آپ نے پھر فرمایا، اسامہ سے نکاح کرے۔ میں نے اسامہؓ سے نکاح کر لیا۔ خدا نے اس میں برکت کر دی اور میں رشک کے قابل ہو گئی۔ اور ایک روایت میں ہے۔ ابو جہمؓ عورتوں کو بہت مارتا ہے اس کو مسلم نے روایت کیا اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے خاوند نے اس کو تین طلاقیں دے دیں۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ آپ نے فرمایا تیرے لئے نفقہ کا کوئی حق نہیں مگر اس صورت میں کہ حاملہ ہوتی:

ان تین احادیث سے غیبت کا حال واضح ہو گیا۔ پہلی حدیث غیبت کی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ جو عیب کسی میں ہو اس کا ذکر غیبت ہے اور جو عیب موجود نہ ہو اس کا ذکر بہتان ہے۔ دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ پیدائشی عیب کا ذکر بھی اسی حکم میں ہے تیسری حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں عیب کا ذکر غیبت نہیں بلکہ شرعاً اس کا ذکر ضروری ہے مثلاً کسی کو صلاح مشورہ دینا ہو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ بنت قیسؓ کو مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ابو جہمؓ عورتوں کو مارتا بہت ہے اور معاویہؓ فقیر ہے اس کے پاس کچھ نہیں اور اسی قسم سے راویوں کے حالات ہیں یعنی جن راویوں کی معرفت احادیث نبویہؐ اور آثار سلف ہم تک پہنچے ہیں محدثین نے ان حالات میں کتابیں لکھی ہیں اور جو جو کسی میں عیب تھا بیان کر دیا یہ دین کی حفاظت کے لئے اور ہماری خیر خواہی کے لئے۔ ورنہ ہمیں دین کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا۔ اور اہل بدعت کی تردید اور کسی کے غلط مسائل کا تذکرہ بہ نیت حفاظت دین بھی اسی قسم سے ہے۔ اسی طرح مظلوم کو اجازت ہے کہ اپنی داد رسی کے لئے ظالم کے عیب بیان کرے اور اگر کوئی شخص دوسرے کے پاس اس نیت سے کسی کا عیب ذکر کرے کہ یہ اس کو نصیحت کرے تاکہ وہ اس برائی سے باز آ جائے اور اس کو امید ہو کہ اس کی نصیحت اس کو مفید ہو گی تو یہ بھی غیبت میں داخل نہیں:

خلاصہ یہ کہ عیب والے کی یا دوسرے کی خیر خواہی کی نیت ہو تو اس صورت میں عیب کا ذکر غیبت نہیں ورنہ غیبت ہو گا۔

گناہ سے تائب پر طعن کرنا کیسا ہے؟

سوال: گناہ سے تائب پر طعن کرنا کیسا ہے؟ ایک مولوی صاحب نے ایک گناہ سے اعلانیہ توبہ کی ہے مگر بعض لوگ پھر بھی طعن کرتے ہیں؟

جواب :۔ حدیث میں ہے اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے گناہ نہ کرنے والا۔ اور یہ بھی حدیث میں ہے جو کسی پر کسی جرم کا طعن کرے اور وہ اس سے بری ہو، تو وہ طعن اس پر لوٹ آتا ہے۔ پس جیسے مولوی صاحب مجرم تھے۔ اب یہ مجرم ہے۔

عبداللہ امرتسری ۲۸ر شعبان ۱۳۵۵ھ

خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت دونوں میں کونسی افضل

سوال :۔ کیا خدا کی عبادت افضل ہے یا مخلوق کی خدمت؟

ایک شخص کہتا ہے کہ خدا ہماری عبادت کا بھوکا نہیں ہے مخلوق ہماری خدمت کی بھوکی اور حاجتمند ہے۔ خدا کی عبادت ۔روزہ ۔حج ۔زکوٰۃ ۔خیر خیرات سب ایک کونے میں رکھدیں اور مخلوق کی خدمت شروع کردیں۔ عبداللہ بن محمد سلیمان از بنگلور سٹی

جواب :۔ خدا بے شک ہماری عبادت کا بھوکا نہیں۔ لیکن ہم تو خدا کی عبادت کے بھوکے ہیں۔ جیسے کھانے پینے بغیر ہماری جسمانی حیات قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح ہماری روحانی بقا عبادت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روحانی بقاء وصال الٰہی سے ہے اور وصال الٰہی عبادت الٰہی سے ہے۔ پس اس حیثیت سے عبادت الٰہی کی ہمیں زیادہ ضرورت ہے۔ مگر حقیقت امر یہ ہے کہ مخلوق کی خدمت عبادت الٰہی سے الگ شے نہیں۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ یعنی میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر خدمت مخلوق کو عبادت الٰہی سے خارج کر دیا جائے۔ تو لازم آتا ہے کہ انسان ہمدردی کے لئے پیدا نہ ہو، حالانکہ اگر انسان کی پیدائش ہمدردی کے لئے نہ ہوتی تو پھر خدا انسان کو اس کا حکم کیوں دیتا؟ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ خدمت مخلوق بھی عبادت الٰہی میں داخل ہے۔ ہاں اگر سوال میں عبادت سے مراد بدنی عبادت ہو تو اس صورت میں بے شک خدمت مخلوق عبادت الٰہی سے الگ شمار ہو سکتی ہے۔ مگر جب پیدائش انسان کی دونوں کے لئے ہے تو دونوں ضروری ہوئیں۔ اور ایک کو غیر ضروری کہنا غلطی ہوئی اور مندرجہ ذیل شہادت سے بھی دونوں کا ضروری ہونا ثابت ہے۔

قرآن مجید میں ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی

وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ہ

یعنی خدا کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، ماں باپ قرابتی کے ساتھ احسان کرو، نیز یتیموں، مسکینوں کے ساتھ سلوک کرو، نیز ہمسایہ قرابتی، ہمسایہ بیگانہ، اپنے پہلو کا ساتھی، مسافر، مملوک ان سب کے ساتھ احسان کرو، تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو خدا بالکل دوست نہیں رکھتا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کی عبادت بھی ضروری ہے اور مخلوق کے ساتھ احسان وسلوک کرنا بھی ضروری ہے۔ دونوں پر عمل کرنا چاہیئے۔ صرف ایک کو افضل سمجھ کر دوسرے میں سستی کرنا جائز نہیں۔

عبداللہ امرتسری ۱۰ رجب ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء

امی ہو کر فتویٰ دینا

سوال:۔ ایک آدمی تمام گاؤں کے اہلِ اسلام کو جو کہ نماز روزہ جمعہ اور جماعت کرنے والے ہیں۔ منافق اور کافر کہتا ہے۔ لیکن مرد مذکور ہے بھی امی ایسے شخص کے متعلق شرع محمدی اور آیت و حدیث کا کیا اشارہ ہے؟ عبدالعزیز گھل کلاں تحصیل موگر ضلع فیروز پور

جواب:۔ مشکوٰۃ شریف باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم فصل اول ص۴۱۳ میں بخاری کی حدیث ہے۔

عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْمِيْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفُسُوْقِ وَلَا يَرْمِيْهِ بِالْكُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ اِنْ لَّمْ يَكُنْ صَاحِبُهٗ كَذٰلِكَ

یعنی حضرت ابوذر رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی شخص کسی شخص کی طرف فسق اور کفر کی نسبت نہیں کرتا مگر وہ فسق اور کفر اس نسبت کرنے والے پر عائد ہوتا ہے، جبکہ اس کا ساتھی ایسا نہ ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی کو ناحق فاسق، کافر، منافق کہے، وہ خود فاسق، کافر، منافق ہو جاتا ہے پس اس مرد مذکور کو اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ کیونکہ جن کو وہ کافر کہتا ہے اگر وہ کافر نہیں ہیں۔ تو اس

حدیث کی رو سے یہ خود کافر ہے نیز امی کا حق فتویٰ کا نہیں۔ تو ایسی حالت میں جس پر اس نے فتویٰ لگایا ہے وہ کافر ہو یا نہ فتویٰ لگانے والا خود کافر ہو جائے گا۔

مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے دخل دے وہ خواہ درست کہے پھر بھی وہ دخل دینے والا ہے۔ (کتاب العلم فصل ۲ ص۲۶)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو بغیر علم کے کوئی بات کہے اگر وہ اس کی بات درست ہو تو بھی غلط ہے کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے۔ علم سے نہیں بلکہ اپنی رائے سے کہتا ہے۔ جب اس کا فتویٰ اس شخص کے حق میں غلط ہوا جس پر اس نے لگایا ہے تو ضرور وہ فتویٰ اس پر لوٹے گا۔ چنانچہ مشکوٰۃ باب حفظ اللسان فصل اول ص۴۱۲ میں ہے۔ اَیُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِاَخِیْہِ کَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِھَا اَحَدُھُمَا۔ یعنی جو اپنے بھائی کو کافر کہے تو دونوں میں سے ایک پر یہ کلمہ ضرور لوٹتا ہے۔ پس جب اس کے بھائی پر نہ لگا۔ تو اس پر لگے گا۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۹ محرم ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۹۳۷ء

کیا صحابہؓ حوض کوثر سے روکے جائیں گے؟

سوال: مسلم شریف "باب استحباب اطالۃ الغرۃ والتحجیل فی الوضوء" میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک گروہ روکا جائے گا میرے پاس آنے سے۔ اور میں کہوں گا کہ یہ میرے صحابہؓ ہیں۔ اور صحابی کی تعریف یہ ہے کہ جس نے با ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور جس نے حضورؐ کو با ایمان دیکھا اس کے لئے جنت کا وعدہ ہے۔ اس مسئلہ کو حل فرمائیں۔

ابو اشفاق محمد اسحٰق

جواب: جس صحابیؓ سے جنت کا وعدہ ہے اس کی یہ تعریف نہیں جو آپ نے کی ہے بلکہ صحابیؓ وہ ہے جس نے ایمان کے ساتھ آپ کی ملاقات کی ہو اور وہ اخیر تک اس ایمان پر قائم رہا ہو۔ اور حدیث مذکور میں جن کا ذکر ہے وہ ایمان پر قائم نہیں رہے لیکن حضور کو اس کا علم نہیں ہو گا کہ یہ قائم نہیں رہے۔ اس لئے آپ کہیں گے کہ یہ میرے صحابہؓ ہیں شاید کہا جائے کہ جو اخیر وقت ایمان پر قائم رہا ہو۔ وہ خواہ صحابی نہ بھی ہو تو بھی اس سے جنت کا وعدہ ہے تو پھر صحابیؓ کی خصوصیت کیا ہوئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خصوصیت دو طرح سے ہے۔ ایک تو ابتداءً جنت میں جانا۔ دوم صحابیت کے

شرف سے کوئی خاص عہدہ عطا ہونا وغیرہ۔

ایک اعتراض یہاں اور پڑتا ہے وہ یہ کہ مسلم کے اسی مقام پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں دوست رکھتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کو دیکھ لوں۔ صحابہؓ نے کہا کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟ فرمایا تم میرے صحابہؓ ہو۔ ——— بھائی وہ ہیں جو بعد آئیں گے۔ صحابہؓ نے کہا۔ بعد والوں کو آپ کس طرح پہچانیں گے؟ فرمایا ان کے منہ اور ہاتھ پاؤں آثار وضو سے چمکیں گے۔ اور میں حوض پر ان کا پیشرو ہوں گا۔ خبردار! کئی لوگ حوض سے روکے جائیں گے۔ میں ان کو آواز دوں گا۔ آؤ۔ مجھے کہا جائے گا۔ کہ انہوں نے آپ کے بعد دین کو بدل دیا۔ میں کہوں گا۔ دور ہوں۔ دور ہوں۔"

ایک اور روایت ابوہریرہؓ سے ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ میری امت میرے پاس حوض کوثر پر آئے گی۔ اور میں دوسرے لوگوں کو حوض سے اس طرح ہٹاؤں گا جس طرح کوئی بیگانے اونٹ اپنے اونٹوں سے ہٹاتا ہے۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ ہمیں پہچانیں گے؟ فرمایا ہاں۔ تمہارے لئے نشانی ہوگی جو کسی اور کے لئے نہ ہوگی۔ تم میرے پاس آؤ گے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں آثار وضو سے چمکیں گے۔ اور ایک جماعت تم سے روکی جائے گی۔ میں کہوں گا۔ یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ فرشتہ جواب دے گا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے تیرے بعد کیا بدعت نکالی؟"

پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد والوں کو آپؐ آثار وضو سے پہچانیں گے۔ اور اس دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کو بھی آپ آثار وضو سے پہچانیں گے مگر ان سے وہ صحابہؓ مراد ہوں گے جن سے آپ کا زیادہ تعارف نہیں ہوا۔ یا جنہوں نے آپ کو دیکھا ہے۔ آپ کی نظر اُن پر نہیں پڑی۔ جیسے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ہزاروں مخلوق ایسی تھی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہؓ کا کہنا کیا آپ ہمیں پہچانیں گے؟ اس سے مراد امت ہو جس سے مراد بعد والے ہوں خیر کچھ ہو یہاں اعتراض پڑتا ہے کہ جب ان کے ہاتھ پاؤں چمکیں گے تو وہ حوض کوثر سے کیوں ہٹائے جائیں گے؟

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کے تین جواب دیئے ہیں۔ کہا ہے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں۔ پھر تین قول ذکر کئے ہیں۔ جن کا خلاصہ مع زیادت درج ذیل ہے۔

ایک یہ کہ منافق اور مرتد ہوں گے۔ ان کو نور ملے گا مگر پھر بجھ جائے گا (جیسے قرآن مجید کی سورۃ حدید میں ہے) دوسرا جواب یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگ ہیں۔ جن سے آپؐ کا تعارف ہے۔ ان

پر وضو۔ کا نشان نہیں ہوگا۔ تیسرا جواب یہ کہ اس سے مجرم اور اہل بدعت مراد ہیں۔ جو حد کفر کو نہیں پہنچے پھر ان میں دو احتمال ہیں ہو سکتا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں چمکیں۔ مگر حوض کوثر سے روکے جائیں گے (آخر کسی وقت ان کی نجات ہو جائے گی۔ جیسے حدیث میں ہے کہ جو لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ ان کی سجدہ کی جگہ نہیں جلے گی۔ پس حوض کوثر پر جانے کے وقت ہی کسی طرح کا یہ چمکنا ہو سکتا ہے) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مجرم اور اہل بدعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگ ہوں۔ جو آپ کے بعد بھی رہے اور خراب ہو گئے ان کو آپ شکلوں سے پہچانیں گے۔ نہ کہ آثار وضو سے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ یہ صحابہؓ ہیں یا نہیں، اگر نہیں تو پھر ان کے متعلق یہ کہنا کہ حد کفر کو نہیں پہنچے غلط ہوا کیونکہ اگر حد کفر کو نہیں پہنچے تو ایمان والے ہوئے اور جو ایمان کیساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہو اور اسی پر اس کا خاتمہ ہوا ہو تو وہ صحابیؓ ہوتا ہے اور اگر یہ صحابہؓ ہوں تو معاذ اللہ لازم آئے گا کہ صحابہؓ بھی ہوں اور اہل بدعت اور مرتکب کبائر بھی ہوں۔ جیسے بہت شیعہ یہی خیال رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس صورت میں پھر ان احادیث کا بھی اعتبار نہیں رہتا۔ پس صحیح یہ ہے کہ آپ کے زمانہ کے جو لوگ روکے جائیں گے۔ وہ منافق مرتد ہوں گے اور جو بعد والوں سے روکے جائیں گے وہ منافق بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ مجرم اور اہل بدعت بھی ہو سکتے ہیں۔ جو حد کفر کو نہیں پہنچے۔ فقط

عبداللہ روپڑی ۱۴/ محرم سنہ ۱۳۷۹ھ ۱۹-سی ماڈل ٹاؤن لاہور

حضرت عیسیٰ کونسا کلمہ پڑھیں گے؟

سوال: حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام جب دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو بطور امتی کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھیں گے یا کوئی اور کلمہ؟

سائل محمد صدیق بی اے ٹیچر ہائی سکول سندیا نوالی ضلع لائلپور

جواب: قرآن مجید میں ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ (پ۳)

ترجمہ :۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لیا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب و حکمت سے عطا کروں پھر تمہارے پاس رسول جائے جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ رسول اسکی تصدیق کرے البتہ تم ضرور اسکے ساتھ ایمان لاؤ گے اور البتہ ضرور اسکی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور کیا تم نے اس شرط پر میرے عہد کا بوجھ اٹھایا انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اب تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی دینے والوں سے ہوں۔

یہ وعدہ گذشتہ انبیاء سے لیا گیا جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی شامل تھے جو جیسے باقی انبیاء علیہم السلام کو آخر الزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنا ضروری تھا۔ ایسے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ضروری ہوا۔

نتیجہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی اُمت کے لئے رسول تھے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہوں گے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک حیثیت سے رسول ہونا اور ایک حیثیت سے اُمتی ہونا اس میں کوئی منافات نہیں۔

حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ فصل ۲)

اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ

"جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری ہے۔ تو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر بطریق اولیٰ ضروری ہوگی۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی کلمہ پڑھیں گے۔"

عبداللہ امرتسری روپڑی لاہور

۱۰ شعبان ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۶۲ء

حضرت خضر علیہ السلام

سوال :۔ کیا حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں اُن کے زندہ ہونے کی کیا نوعیت ہے ان کی زندگی

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں کیا فرق ہے کیا خضر معہ جسد خاکی زندہ ہیں؟

عبدالمجید متعلم بی اے ٹواٹمنڈ بیکری نزد بچھو کی گھٹی

شاہی بازار حیدر آباد (سندھ)

جواب: حضرت خضر علیہ السلام کی حیات کے متعلق کوئی صاف روایت نہیں، کہ وہ زندہ ہیں صرف آب حیات کی جگہ رہنے سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اس قسم کی بعض اور روایتیں بھی ہیں جیسے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آواز آئی جس میں گھر والوں کو صبر کی تلقین کی گئی۔ اس موقع پر حضرت علیؓ نے کہا یہ آواز دینے والے حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔

(مشکوٰۃ باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصل ۳ صفحہ ۵۵)

لیکن یہ حدیث بالکل ضعیف ہے۔ قابلِ استدلال نہیں۔ اگر اس کو تسلیم بھی کیا جائے تو اس سے زندگی ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معراج کی رات انبیاء کرام علیہم السلام کی گفتگو ہوتی ہے حالانکہ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باقی انبیاء، بالاتفاق فوت ہو چکے تھے سوالیسے ہی اگر فوت شدہ کی آواز زندہ نے سنی ہو تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ یہ چیز کرامت کی قسم سے ہو سکتی ہے۔

عبداللہ روپڑی۔ لاہور

نیکی اور بدی کا خالق

سوال: نیکی اور بدی کا خالق کون ہے؟ قرآن مجید میں ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی نہیں ہلتا تو بدی کرنے میں گرفت کیسی؟

جواب: قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں جس کا یہ معنی ہو کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی نہیں ہلتا ہاں کفار سے قرآن مجید نے یہ حکایت کی ہے۔

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (پ ۸)

"اگر خدا چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ کسی شے کو حرام کرتے۔"

خدا تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:۔

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ

فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۔ (پ۸)

ترجمہ:۔ پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح تکذیب کی یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے عذاب کا مزا چکھا۔ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دے کیا تمہارے پاس اس بات پر کوئی دلیل ہے؟ اگر ہے تو اس کو ہمارے سامنے پیش کرو۔ تم محض گمان کی تابعداری کرتے ہو اور محض اٹکل کے پیچھے جاتے ہو۔

اس آیت میں خدا نے کتنے زور سے تردید کی ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا نہیں کراتا بلکہ یہ محض تمہارا خیال اور محض تمہاری اٹکل ہے اس پر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ لیکن خالق ہونا اور شئے ہے اور کاسب (کمانے والا) ہونا اور شئے ہے۔ خدا خالق ہے۔ بندہ کاسب کمانے والا ہے۔ ان دونوں میں جو کچھ فرق ہے اس کو ہم پہلے واضح کر چکے ہیں۔

خدا حاضر ناظر ہے تو وحی کہاں سے آتی ہے؟

سوال:۔ خدا ہر جگہ حاضر ناظر ہے اور نحن اقرب من حبل الورید بھی ہے تو وحی کہاں سے اترتی تھی؟

جواب:۔ خدا علم قدرت کے ساتھ ہر جگہ ہے بذاتہٖ عرش پر ہے اور آیہ کریمہ ونحن اقرب من حبل الورید میں علم مراد ہے یا فرشتے جیسے کہتے ہیں، فلاں بادشاہ فلاں بادشاہ سے لڑ رہا ہے حالانکہ لڑنے والی فوج ہوتی ہے۔ آگے فرشتوں کا ذکر بھی ہے جو اعمال لکھتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ یعنی ہم اس وقت شاہ رگ سے زیادہ قریب ہوتے ہیں جب وہ لینے والے بیٹھے ہوئے لیتے ہیں۔

روح پاک ہے یا پلید؟

سوال:۔ روح پاک چیز ہے یا پلید؟ اگر پاک ہے تو کافروں کو نجس کیوں کہا گیا؟ کیونکہ ان میں بھی روح ہے۔ اگر پلید ہے تو پاک کوئی بھی نہیں؟

جواب:۔ حدیث میں ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ

ترجمہ:۔ "ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ یہودی بناتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی"
قرآن مجید میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے۔ ارشاد ہے:۔
فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ
ترجمہ: خدا کی فطرت (توحید) کو لازم پکڑو جس پر لوگوں کو پیدا کیا اس کو نہ بدلو۔
اس آیت و حدیث سے معلوم ہوا کہ پیدائش کے وقت رُوح پاک ہوتی ہے پھر شرک سے نجس ہو جاتی ہے۔

جب ہر نفس کو موت ہے تو جنّت دوزخ کس کے لئے؟

سوال:۔ ہر چیز کی خواہش کرنے والا ہے اور نفس ہی کو موت ہے تو بہشت و دوزخ کس کے لئے ہیں۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ؟

جواب:۔ موت کے چکھنے سے مراد یہ ہے کہ بدن سے جان قبض کی جاتی ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔
اللہ یتوفی الانفس حین موتہا (پ۲۴) (ترجمہ) "خدا موت کے وقت جانوں کو قبض کرتا ہے"
نیز جب بہشت دوزخ میں داخل ہونے کا وقت ہو گا۔ روحیں بدلوں میں لوٹائی جائیں گی۔ قرآن مجید میں ہے۔
وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (پ۳۰) (ترجمہ) جب جانیں (بدلوں سے) ملائی جائیں۔
نیز خدا خالق ہے وہ نیست سے ہست کر سکتا ہے تو پھر بہشت و دوزخ کس کے لئے کہنے کا کیا مطلب؟

آنحضرتؐ بندہ ہیں یا خدا

سوال:۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بندہ تھے یا خدا؟ قرآن میں ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
اور رسول کا نام محمدؐ ہے جو مفعول کا صیغہ ہے یعنی حمد کیا گیا۔ اور حمد کیا گیا تو خدا ہے۔ معلوم ہوا کہ محمدؐ خدا تھا؟

جواب:۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جن کمالات کی بناء پر "محمدؐ" کہا گیا ہے وہ خدا کے دیئے ہوئے ہیں اس لئے محمدؐ کی حمد عارضی ہے اور حقیقۃً حمد خدا کے لئے ہے۔ پس محمدؐ خدا نہ ہوا کیونکہ اس کے لئے حقیقی حمد نہیں۔

قرآن مجید میں ہے:۔
عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (پ۱۵) (ترجمہ) "اُمید ہے خدا تجھے مقام محمود میں اٹھائے"

اس آیت میں مقام کو محمود کہا ہے تو کیا وہ بھی خدا ہے ؟

اگر اس کو منطقی پیرایہ میں ادا کریں تو مخالف کا دعویٰ یوں ہوگا مُحَمَّدٌ مَحْمُوْدٌ وَکُلُّ مَحْمُوْدٍ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ اللّٰہُ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حد اوسط مکرر نہیں کیونکہ صغریٰ میں محمود سے مراد ہے جس کے لئے عارضی حمد ہو اور کبریٰ میں مراد ہے جس کے لئے حقیقی حمد ہو اور اگر کبریٰ میں بھی عارضی حمد ہو تو پھر کبریٰ کاذب ہے۔

اس کے علاوہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا حاصل اَللّٰہُ مَحْمُوْدٌ ہے اس صورت میں مُحَمَّدٌ مَحْمُوْدٌ کو اس کے ساتھ ملائیں تو شکل ثانی بنے گی۔ اور شکل ثانی میں اختلاف فی الکیف شرط ہے جو یہاں مفقود ہے پس نتیجہ نہیں ہوگی۔ وفیہ تنظّر

جب اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے تو بندہ کو ہدایت کیوں نہ ہوئی ؟

سوال:۔ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کُن کہتا ہے کیا دُنیا کو ہدایت کرنے کا ارادہ کیا تھا یا نہیں ؟

جواب:۔ ہدایت دو طرح کی ہے ایک اِرَاءَۃُ الطَّرِیْقِ یعنی رستہ دکھلا دینا۔ اور حق ناحق سمجھا دینا۔ اس کا ارادہ اللہ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَیَھْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (پ۵) (ترجمہ) "خدا ارادہ کرتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کرے اور تمہیں پہلے لوگوں کو طریقوں کی ہدایت کرے"۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا بندوں کو ہدایت کا ارادہ کرتا ہے اور وہ ہو بھی جاتی ہے۔ یعنی بندہ کو حق ناحق کا بتلانے سے پتہ لگ جاتا ہے آگے خواہ قبول کرے یا نہ۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (پ۲۹)

"ہم نے انسان کو ہدایت کی آگے وہ شکر کرنیوالا ہے یا کفر کرنیوالا ہے"۔ یہ ایک طرح کی ہدایت ہوئی۔

دوم اَلْدِّلَالَۃُ الْمُوْصِلَۃُ یعنی حق کو پہنچا دینا اور بندہ کے اختیار کے بغیر دل میں اس کو جگہ دیدینا۔ اس کا اللہ ارادہ نہیں کرتا کیونکہ پھر بندہ فعل مختار نہیں رہتا۔ قرآن مجید میں ہے۔ فَلَوْ شَاءَ لَھَدٰکُمْ اَجْمَعِیْنَ (پ۸) (ترجمہ) خدا چاہتا تو تمہیں سب کو ہدایت کر دیتا۔ یعنی تمہارے اختیار کے بغیر محض قدرت کے تصرف سے

عہ فیہ اشارۃ الی ان معنی الحمد للّٰہ رب العلمین ان کل حمد للّٰہ ومختص بہ فحصل ان کل محمود اللّٰہ فتامل۔ ۱۲

تمہیں ہدایت والے بنانا چاہتا، جیسے فرشتوں کو ایسے ہی کیا ہے تو تم سب ہدایت والے ہوجاتے لیکن وہ اسطرح نہیں کرتا بلکہ تمہیں اپنے اختیار پر چھوڑا ہے تاکہ اپنے اختیار سے نیکی بدی کر کے بدلے کے مستحق بنو، اگر جبراً ہدایت کر دیتا تو بندہ کے اختیار کو دخل نہ ہوتا تو پھر اس میں بندے کا کیا کمال تھا اور وہ انعام کا مستحق کس طرح ہو سکتا پس ضروری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کا ارادہ نہ کرے۔

ابلیس جنّ ہے یا فرشتہ

سوال:۔ ابلیس فرشتوں میں تھا یا کہ پہلے ہی الگ تھا؟

جواب:۔ قرآن مجید میں ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ (پ۱۵) یعنی "ابلیس جنّوں سے تھا" اس میں دو قول ہیں بعض کہتے ہیں فرشتوں کی ایک جماعت ہے ان کو جنّ کہتے ہیں، ابلیس ان سے تھا بعض کہتے ہیں نہیں بلکہ جنّوں سے تھا۔ پہلے قول کی بناء پر فرشتوں سے تھا۔ دوسرے قول کی بناء پر کثرتِ عبادت کی وجہ سے فرشتوں سے ملا دیا۔

خالق غالب یا مخلوق

سوال:۔ کیا خالق غالب ہے یا مخلوق؟

جواب:۔ خالق غالب ہے اگر وہ محض اپنی قدرت کا تصرف کرے تو نہ ابلیس کچھ کر سکتا ہے نہ کوئی اور۔ ہاں اگر وہ فضل مختار بنا دے تو پھر دوسرے کے اختیار کا بھی دخل ہوجاتا ہے خواہ نیکی کرے یا بدی، جیسے اوپر بیان ہو چکا ہے۔

جب ہر شئے تسبیح کرتی ہے تو پھر کافر کون

سوال:۔ قرآن کریم میں ہے یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یعنی "ہر چیز زمین آسمان کی اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے تو کافر کون ہوا کیونکہ وہ بھی زمین کی چیز ہے۔" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَنْبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا؟

جواب:۔ تسبیح دو طرح ہے ایک زبان قال سے ایک حال سے شانی اللہ کو تو سب کرتے ہیں، اوّل اللہ کو بعض کرتے ہیں بعض نہیں کرتے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ

فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ

(پ ۱۷) ترجمہ: آسمان و زمین والے اور سورج، چاند، ستارے، درخت اور بہت سے لوگ یہ سب اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور بہت لوگوں پر (سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے) عذاب الٰہی ثابت ہو گیا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۴ شعبان ۱۳۵۶ھ

آفتاب کا کیچڑ کے چشمہ میں غروب اور شیطان کے سینگوں میں طلوع ہونا

سوال: ایک شخص اعتراض کرتا ہے کہ نماز فجر کے متعلق مسلم کی ایک حدیث میں لکھا ہے کہ "وقت نماز صبح کا فجر کے طلوع ہونے سے آفتاب کے طلوع ہونے تک ہے۔ پس جس وقت سورج طلوع ہو تو تو نماز سے ہٹ جا کیونکہ وہ درمیان شیطان کے دو سینگوں کے طلوع ہوتا ہے۔" (اب اس پر حاشیہ لکھا ہے) سورج کا شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہونا ملاحظہ ہو۔ اب اگر اس حدیث کی بنا پر آریہ عیسائی اسلام پر ہنسی اڑائیں تو اس کا کیا قصور ہے۔ سورج بالاتفاق زمین سے بہت بڑا ہے۔ تو خیال کیجئے شیطان کے سینگ کتنے بڑے ہوں گے۔ جن کے درمیان خود آنا بڑا سورج آجاتا ہے۔ اور خود شیطان کتنا بڑا ہوگا جس کے اتنے بڑے سینگ ہیں۔ پھر یہ شیطان اہلحدیث کے دلوں میں گھس جاتا ہے اور وسوسے بھی ڈالتا ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ شیطان کے سینگوں پر سورج کیوں لادا گیا کیسی معقول حدیث ہے اور پھر شرح کیسی معقول ہوئی کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ کا رسول جو کہ عقل و دانش ہر بات میں اپنے تمام لوگوں سے افضل ہوتا ہے ایسی لغو اور بے سروپا باتیں کہے۔ ہرگز نہیں قطعاً ناممکن ہے۔ ہمارے پیارے نبی کے ذمہ یہ خرافات کسی ایسے شخص نے گھڑ کر لگائے ہیں جو کہ عقل کا بودا اور آپ کا پکا دشمن ہے۔ کوئی یہودی یا عیسائی ہے ایسا قبیح کام کسی مسلمان باایمان کا نہیں ہو سکتا۔ بیچارے امام مسلمؒ نے بے سوچے سمجھے کسی یہودی یا عیسائی کی حدیث کو جو کہ پیغمبر علیہ السلام کا پکا دشمن ہے اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ ورنہ پیغمبر علیہ السلام کی شان نہیں جو ایسی باتیں کہے۔" اس کا مدلل جواب دیجئے؟

محمد اکرم خان ناظر سرک توپ خانہ محلہ نمدہ گراں۔ دہلی

جواب: انسان کو چاہیئے کہ جس بات پر اعتراض کرے پہلے اس کا صحیح مطلب سمجھے کیونکہ بے سمجھی سے اعتراض

درحقیقت اس بات پر اعتراض نہیں ہوتا بلکہ اپنی عقل کی خفت ہوتی ہے۔ مخالفین قرآن کو جھٹلاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ یعنی "انہوں نے ایسی شئے کو جھٹلا دیا جس کے علم کا احاطہ نہیں کیا" سو جو اس حدیث پر اعتراض کرتا ہے اس کو اس حدیث کا اصل مطلب سمجھ لینا چاہیئے۔ ورنہ ویسے تو مخالف قرآن مجید پر بھی مذاق اُڑاتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ قرآن میں ہے تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ یعنی "آفتاب کیچڑ والے چشمے میں غروب ہوتا ہے۔" تو کیا اس مذاق سے قرآن مجید پر کچھ اثر پڑا؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ آیت کا مطلب وہ نہیں جو مخالف سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ اس کی اور توجیہات بھی ہیں۔ اسی طرح اس حدیث کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہمارے لحاظ سے آفتاب شیطان کے سینگوں کے درمیان نکلتا ہے۔ جیسے قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا۔ یعنی ذوالقرنین نے آفتاب کو ایک قوم پر نکلتے پایا جن کے لئے آفتاب کے ورے ہم نے کوئی پردہ نہیں کیا۔"

کیا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب اس قوم پر طلوع کرتا ہے ہم پر طلوع نہیں کرتا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ چونکہ وہ مشرق کی جانب ہماری نسبت سورج کے قریب ہیں۔ تو ہمارے لحاظ سے آفتاب ان پر نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ذوالقرنین نے ایسا پایا۔ نہ کہ حقیقت میں ایسا تھا۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی بابت فرمایا يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ یعنی "موسیٰ علیہ علیہ السلام کو خیال آیا کہ جادوگروں کی سوٹیاں رسیاں دوڑتی ہیں"

ٹھیک اسی طرح حدیث کا مقصود ہے کہ ہمارے لحاظ سے سورج شیطان کے سینگوں میں نکلتا ہے۔ سینگوں سے مراد شر[1] ہے۔ سورج نکلتے وقت اور غروب ہوتے وقت سورج کے پوجنے والے سورج کی پوجا کرتے ہیں تو شیطان اس وقت سورج کی طرف نزدیک ہوتا ہے۔ تاکہ وہ پوجا درحقیقت اس کی ہو۔ جیسے وہ پتھر اور درخت جن کی پوجا ہوتی ہے۔ ان میں شیطان قرب کرتا ہے۔ تاکہ اس کو سجدہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ہے۔ إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا۔ یعنی "یہ لوگ نہیں پکارتے مگر عورتوں کو

---

[1] جیسے معاویہ رضؓ نے اپنی خلافت کو ثابت کرتے ہوئے کہا من يطلع لنا قرنه "کون ہمارے لئے اپنا سینگ نکالتا ہے" یعنی ہمارے مقابلہ میں سر اُٹھاتا ہے۔ ۱۲

(جنیوں کو نہیں پکارتے مگر شیطان سرکش کو)

چونکہ اس دین میں توحید کامل ہے۔ اس لئے مشابہت شرک سے بھی منع فرمادیا۔ جیسے قبرستان میں نماز پڑھنا منع ہے۔ گھروں میں تصویریں رکھنا منع ہے۔ اسی طرح غروب اور طلوع کے وقت نماز منع ہے۔ تاکہ سورج کے پوجنے والوں سے مشابہت نہ ہو۔ بس اس حدیث کا صرف اتنا مطلب ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور وجوہات بھی ہیں مگر کمی فرصت کی وجہ سے اسی پر اکتفاء کی گئی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

تبلیغ میں تشدد اور نرمی؟ دونوں سے کونسی صورت بہتر ہے؟

سوال:۔ زید کہتا ہے ایک جماعت بندی ہو جائے جو کہ بے نمازوں سے بالکل قطع تعلق پیدا کرے یعنی بے نمازوں کو اپنے معاملات دینی و دنیاوی بلکہ سلام و کلام سے بھی دور کر دیا جائے چنانچہ زید نے ایک تحریک اٹھائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمرو جماعت سے اٹھ کھڑا ہوا کہ ایسا نہ ہونا چاہئے۔ اتفاق و اخلاق کے طور پر ہر ایک کو مرتبہ مرتبہ سمجھاؤ جو خلق سے کام فی زمانہ کامیاب ہو سکتا ہے وہ کسی کو دور کرانے سے نہیں ہو سکتا۔ زید اس کے جواب میں من رای منکم منکرا حدیث کا ٹکڑا پیش کرتا ہے۔ عمرو کہتا ہے قطع تعلق سے فتنہ بڑھ جانے کا خطرہ ہے کیونکہ حکومت غیر اسلام ہے (تم اپنا ایمان، تبلیغ) مذکورہ بالا حدیث کے اخیر کے دو ٹکڑا کے مطابق سمجھو یعنی دل سے برا جاننا۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا زید کے ذہن کے پیچھے لگ کر سلسلہ مقاطعت شروع کر دیا جائے یا کہ عمرو کی رائے کے مطابق خلق سے کام لینا بہتر ہے؟ بینوا بالدلیل توجروا عند الجلیل۔

جواب:۔ یہاں پر کل چار صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اپنا زور ہو اور جس کو تبلیغ کرنی ہے وہ باخبر ہو۔ دوم یہ کہ اپنا زور ہو لیکن جس کو تبلیغ کرنی ہے وہ بے خبر ہو۔ سوم یہ کہ اپنا زور نہ ہو اور جس کو تبلیغ کرنی ہے وہ باخبر ہو۔ چہارم یہ کہ اپنا زور نہ ہو اور جس کو تبلیغ کرنی ہے وہ بے خبر ہو۔

نوٹ:۔ زور سے مراد عام ہے خواہ حکومت یا پنچایت ہو خواہ ذاتی طور پر کوئی شخص بارعب ہو جس کی وجہ سے لوگوں کے دل میں خوف ہو کہ اگر ہم اس کی نہ مانیں گے تو ہمیں اس سے نقصان پہنچے گا۔

پہلی صورت کا حکم جب ایک شخص مسئلہ سے واقف ہے اور دیدہ و دانستہ عمل میں سستی کرتا ہے تو اس پر درجہ بدرجہ زور ڈالا جائے۔ مثلاً پہلے اس کو دیسے سمجھایا جائے اگر نہ سمجھے تو کسی قدر تاوان لگایا جائے یا زجر و توبیخ کی جائے۔ اس کے بعد مار پیٹ چنانچہ قرآن مجید میں عورتوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ (پ۵ ع ۳)

"جن عورتوں کی بدگزرانی سے تم ڈرتے ہو ان کو پہلے وعظ کرو پھر بستروں میں چھوڑ دو۔ پھر مارو۔"

غرض درجہ بدرجہ مفید اور بہتر صورت اختیار کرنی چاہیئے۔

دوسری صورت کا حکم مسئلہ سے ناواقف کو پہلے پیار سے واقف کرنا چاہیئے جس میں تالیف قلبی بھی داخل ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

والمؤلفة قلوبهم (پ۱۰ ع ۱۴) یعنی نومسلم جن کی تالیف قلبی کی گئی ہے ان کا بھی زکوٰۃ میں حق ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى یَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ۔ (پ۱۰ ع ۷)

اگر کوئی مشرک تجھ سے امن چاہے تو اس کو امن دیدے تاکہ وہ کلام الٰہی سنے پھر اس کو اس کی امن کی جگہ میں پہنچا دے کیونکہ وہ بے سمجھ قوم ہے (جن کو سمجھانا ضروری ہے)

اگر مسئلہ ذہن نشین ہونے کے بعد پھر وہ سستی یا بے پرواہی کرے تو اس کا علاج بھی اول الذکر صورت کا ہے

تیسری صورت کا حکم جب اپنا زور نہیں اور مسئلہ سے باخبر ہے تو سوا وعظ نصیحت کے کوئی صورت نہیں مگر وعظ نصیحت کی ضرورت بھی تھوڑی بہت امید کے وقت ہے ورنہ پھر قطع تعلق ہے جیسا قرآن میں ہے۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى نصیحت کر اگر فائدہ دے نیز قرآن مجید میں ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ (پ۹ ع ۱۱)

یعنی جب ایک جماعت نے ہفتہ والوں سے دوسری جماعت کو کہا کہ تم ایسی قوم کو کیوں وعظ کرتے ہو جن کو خدا ہلاک کرنے والا ہے یا کوئی اور سخت عذاب دینے والا ہے؟ وعظ کرنے والوں نے جواب دیا کہ ہمارا وعظ دو وجہوں سے ہے۔ ایک خدا کے پاس ہمارا عذر ہوگا کہ ہم نے تبلیغ

کا فرض ادا کر دیا۔ دوم شاید یہ وعظ نصیحت کے اثر سے گناہ سے بچیں:

خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ہفتہ کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع فرمایا وہ چھٹکر تین جماعتیں ہو گئے (۱) ایک مچھلیاں پکڑنے لگ گئے۔ ایک اُن کو روکتے رہے۔ ایک نہ روکتے نہ مچھلیاں پکڑتے، اس تیسری جماعت نے دوسری جماعت کو کہا کہ تم ان (پہلی جماعت) کو کیوں وعظ کرتے ہو، یہ ہلاک ہونے والے ہیں یا ان پر کوئی اور سخت عذاب آنے والا ہے انہوں نے جواب میں دو وجہیں بیان کیں۔ ایک تبلیغی فرض کی ادائیگی دوم فائدہ کی اُمید اگر فائدہ کی امید نہ ہوتی تو تبلیغی فرض بھی عاید نہ ہوتا کیونکہ تبلیغ وہیں ضروری ہے جہاں کچھ امید ہو چنانچہ پہلی آیت سورۃ اعلیٰ سے معلوم ہو چکا۔

خلاصہ یہ کہ زور نہ ہونے کی صُورت میں مسئلہ سے ناواقف آدمی کو نرمی کے سوا سمجھانے کی کوئی صورت نہیں۔ جس کے لیے مختلف پہلو اختیار کئے جا سکتے ہیں جن کو وعظ تبلیغ کا لفظ شامل ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (پ۱۴ ع اخیر)

"حکمت عملی، وعظ اچھی کے ساتھ خدا کے راستہ کی طرف دعوت دے۔ اور بہتر طریق سے ان سے مناظرہ کر:"

چوتھی صورت کا حکم

یہ صورت سب صورتوں سے مشکل ہے کیونکہ ایک طرف مسئلہ سے ناواقفی ہے۔ دوسری طرف زور نہیں کہ زبردستی ان کے کان آواز پہنچا دی جائے۔ کسی کی مرضی ہو نے کسی کی مرضی ہو نہ سُنے۔ تیسری صورت میں بوجہ ناواقفی مسئلہ کے تبلیغی فرض چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ چوتھی صورت میں بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ اس میں مسئلہ سے ناواقفی ہے جس سے واقف کرانا ضروری ہے اگر زور ہوتا تو اس کے اثر سے واقف کرانا سہل تھا۔ اب بجز جفاکشی کے کیا صورت ہے انبیاء علیہم السلام کا اکثر یہی منصب تھا اور ان کی تبلیغ عموماً اسی صُورت میں ہوتی تھی۔ خاص کر ابتدائی حالات میں انبیاء علیہم السلام کو سخت ترین مصائب کا سامنا ہوتا اور بڑے بڑے روح فرسا آلام برداشت کرنے پڑتے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمبر اوّل ہے۔ چنانچہ مکی زندگی آپ کی اس کا شاہد عدل ہے۔ یہ جو کچھ تکالیف ہیں مسائل کی واقفیت تک ہیں۔ اس کے بعد پھر وہی تیسری صورت کا حکم ہے:

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں تشدد چاہیے بعض میں عفو۔ نہ ہمیشہ سختی اچھی ہے نہ ہمیشہ

نرمی شیخ سعدی مرحوم فرماتے ہیں کہ ؎

سختی و نرمی بہم در بہ است ❊ چو جراح کہ رگ زن و مرہم نہ است

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۸ ربجادی الاول ۱۳۵۸ھ

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا؟

سوال:۔ زید کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا اثر ہوگیا تھا چنانچہ بخاری شریف مصری باب السحر جلد ۴ صفحہ ۱۵۱ مسلم شریف باب السحر جلد ۲ صفحہ ۲۲۱۔ اور نیل الاوطار مصری باب ماجاء فی حد الساحر جلد ۷ صفحہ ۱۴۲ میں مفصل احادیث مسطور ہیں۔

بکر کہتا ہے کہ اپنا مطلب سیدھا کرنے کے لئے یہ بھی گھڑ لیا گیا ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی یہودن نے سحر کیا تھا اور آپ نعوذ باللہ مسحور ہو گئے تھے۔ العیاذ باللہ پیغمبر علیہ السلام پر سحر کا عمل ہو جائے اور آپ مسحور ہو جائیں یہ کس طرح ممکن ہے؟

(۱) زید اور بکر میں کون حق پر ہے؟ (۲) کیا اس کو انکار حدیث کہہ سکتے ہیں جبکہ بکر کو حدیث بھی دکھائی گئی ہو، اور وہ تسلیم نہ کرے؟ (۳) اس کے ساتھ اقتداء بالصلوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ (۴) اس کے اس رسالہ کے پڑھنے کے متعلق کیا حکم ہے۔ جس میں اُس نے اسی موضوع پر بحث کی ہو چنانچہ خط کشیدہ عبارت اس کے رسالہ مذکورہ کی ہے۔ (۵) ان تتبعون الا رجلا مسحوراً۔ الآیۃ (بنی اسرائیل) اس کا کیا جواب ہے؟ بینوا بالدلیل توجروا عند اللہ الجلیل۔

(المستفتی۔ قاضی محمد نواز ساکن واجل ضلع ڈیرہ غازیخاں پنجاب)

جواب:۔ جو لوگ بخاری کی حدیث سے انکار کرتے ہیں اُن کی بڑی دلیل یہ آیت ہے۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ یعنی کفار کہتے ہیں تم نہیں اتباع کرتے مگر ایک جادو کئے گئے کی۔

آیت و حدیث میں کوئی تعارض نہیں، کفار کی مراد مسحور سے دیوانہ ہے۔ جس کی عقل ٹھکانے نہ ہو اور حدیث بخاری میں حافظہ پر اثر مراد ہے چنانچہ حدیث میں تصریح ہے۔

حَتّٰی اِنَّہٗ لَیُخَیَّلُ اِلَیْہِ اَنَّہٗ فَعَلَ الشَّیْءَ وَمَا فَعَلَہٗ

یعنی یہاں تک کہ آپ کو خیال ہوتا کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے اور درحقیقت کیا نہ ہوتا۔

ان الفاظ سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ جادو کا اثر حافظہ پر تھا عقل پر نہ تھا کیونکہ کام کرنے نہ کرنے کے متعلق یاد نہ رہنا یہ حافظہ کا کام ہے اور حافظہ اور عقل دو قوتیں الگ الگ ہیں۔ دیکھئے بچپن میں حافظہ قوی ہوتا ہے اور عقل کم اور معمر ہو کر عقل بڑھ جاتی ہے اور حافظہ میں فرق آجاتا ہے۔ پس حافظہ پر اثر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ عقل پر بھی اثر ہو۔

دوسری بات ان الفاظ سے یہ معلوم ہوئی کہ حافظہ پر اثر سے بھی یہ مراد نہیں کہ آپ کو معاذ اللہ قرآن مجید بھول گیا ہو یا اس طرح کا کوئی اور نقصان ہو گیا ہو بلکہ یہ صرف اس حد تک تھا کہ جزوی فعل میں کبھی بھول چوک ہو جاتی اور جزوی فعل میں بھول چوک معمولی بات ہے۔ مثلاً نماز میں آپ کئی دفعہ رکعتیں بھول گئے اور فرمایا اَنْسیٰ کَمَا تَنْسَوْنَ۔ یعنی جیسے تم بھول جاتے ہو میں بھی بھول جاتا ہوں۔ بتلایئے یہ بھولنا کوئی دین میں نقصان دہ تھا؟ پس اگر جادو کے اثر سے عام بھولنے کی نسبت کسی قدر زیادہ بھول چوک ہو جاتی ہو تو یہ بھی دین کے منافی نہیں۔ بلکہ بعض روایات میں اس جزوی فعل کی تعیین بھی آئی ہے۔ فتح الباری میں ہے۔

قد قال بعض الناس ان المراد بالحدیث انہ کان صلی اللہ علیہ وسلم یخیل انہ وطیٔ زوجاتہ ولم یکن وطئھن وھذا کثیرًا ما یقع تخیلہ فی الانسان فی المنام فلا یبعد ان یخیل الیہ فی الیقظۃ قلت وھذا قد ورد صریحًا فی روایۃ ابن عُیینۃ فی الباب الذی یلی ھذا ولفظہ حتی کان یری انہ یأتی النسآء ولا یأتیھن وفی روایۃ الحمیدی انہ یأتی اھلہ ولا یأتیھم۔

(فتح الباری باب السحر جزء ۲۴ ص۴۳۵)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں مراد یہ ہے کہ آپ کو اپنی بیویوں کے پاس جانے کا خیال آتا مگر آئے نہ ہوتے اور ایسا خیال خواب میں بہت آتا ہے۔ پس بیداری میں بھی کوئی بعید نہیں میں (صاحب فتح الباری) کہتا ہوں کہ جو کچھ بعض نے حدیث کی مراد بیان کی ہے یہ بعض روایتوں میں صریحاً آیا ہے کہ آپ کو اپنی بیویوں کے پاس آنے کا خیال آتا مگر آئے نہ ہوتے۔

اور فتح الباری کے اسی صفحہ میں ہے۔

وَفِیْ حَدِیْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ عِنْدَ ابْنِ سَعْدٍ مَرِضَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاُخِذَ عَنِ النِّسَاءِ وَالطَّعَامِ وَالشَّرَابِ فَھَبَطَ عَلَیْہِ مَلَکَانِ (الحدیث)

ترجمہ:۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوگئے اور عورتوں اور کھانے پینے سے روکے گئے پس آپ پر دو فرشتے اُترے (جنہوں نے جادو کرنے والے کا نام اور جن اشیاء میں جادو کیا اور جہاں اُن کو دفن کیا سب بتلا دیا۔ آپؐ نے ان اشیاء کو نکلوایا خدا نے شفا دے دی)

اور فتح الباری میں اس سے چند سطر پہلے ایک روایت کے یہ الفاظ ذکر کئے ہیں۔ حَتّٰى كَادَ يُنْكِرُ بَصَرَهُ یعنی جادو کے اثر سے قریب تھا کہ آپؐ کی بصارت میں فرق آجائے۔"

اِن روایتوں سے معلوم ہُوا کہ جادو کا اثر آپؐ کے بدن پر ایسا ہی ہُوا تھا جیسے ظاہری امراض سے بدن میں کمزوری آجاتی ہے۔ اور اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور اشیاء وغیرہ بند ہو جاتی ہیں۔

رہا عقل اور سمجھ کا معاملہ اور وحی تبلیغ کا سلسلہ اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی لئے فرشتے اُترے اور انہوں نے سب کچھ بتا دیا یہاں تک کہ خدا نے شفا دے دی۔ اگر وحی میں فرق پڑ جاتا تو فرشتے کس طرح اُترتے۔ پس واقعہ نبوت کے منافی نہیں بلکہ یہ واقعہ آپؐ کی نبوت کی مزید تائید ہے۔

فتح الباری میں ہے۔

وَقَعَ فِي مُرْسَلِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ كَعْبٍ عِنْدَ ابْنِ سَعْدٍ فَقَالَتْ اُخْتُ لَبِيْدِ بْنِ الْاَعْصَمِ اَنْ يَّكُوْنَ نَبِيًّا فَسَيُخْبَرُ وَاِلَّا فَسَيُذْهِلُهُ هٰذَا السِّحْرُ حَتّٰى يُذْهِبَ عَقْلَهُ۔ (فتح الباری جزء ۲۴ صہ ۴۳۵)

ترجمہ:۔ عبد الرحمٰن بن کعبؓ کہتے ہیں لبید بن اعصم (یہودی جس نے جادو کیا تھا اُس) کی بہن نے کہا، اگر یہ نبی ہوگا تو اس کو خدا کی طرف سے اطلاع مل جائے گی (کہ فلاں نے جادو کیا اور فلاں شئے میں کیا اور فلاں جگہ دفن کیا) اور اگر نبی نہ ہُوا تو یہ جادو اس کی عقل کو نقصان پہنچائے گا۔ یہاں تک کہ اس کی عقل کو لے جائے گا۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ وحی آئی اور فرشتے اُترے اور سب حال کھول کر بتلا دیا کہ فلاں شخص نے جادو کیا اور فلاں فلاں شئے میں کیا اور فلاں کنوئیں میں دفن کیا چنانچہ بخاری وغیرہ میں اس کی تفصیل ہے۔ تو لبید بن اعصم کی بہن کے قول کے مطابق یہ واقعہ آپؐ کی نبوت کی دلیل ہُوا۔ اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے جنگ خیبر کے موقعہ پر آپؐ کو زہر دینے والی یہودیہ عورت نے بھی یہی کلمے کہے تھے کہ اگر یہ نبی ہوگا تو اس کو زہر نقصان نہیں دے گا۔

یعنی اس سے ہلاک نہیں ہوگا۔ ورنہ بدنی تکلیف آپ کو بہت ہوئی اور ہمیشہ رہی یہاں تک کہ آخر آپ نے اسی سے وفات پائی۔ مگر چونکہ یہ وفات آپ کی خلاف معمول معجزانہ رنگ میں تھی کیونکہ عادت کے مطابق تو آپ کو اسی وقت ہلاک ہو جانا چاہیئے تھا جبکہ زہر دیا گیا نہ کہ کئی سالوں کے بعد جبکہ نبوت کا مقصد پورا ہو چکا نیز اسی گوشت نے آپ کو خبر دی جس میں زہر ملایا گیا تھا۔ پس جیسے یہ واقعہ آپ کی نبوت کی دلیل ہے ایسے ہی جادو کا واقعہ ہے!

ناظرین خیال فرمائیں کہ جادو کرنے والے دشمن تو اس واقعہ کو آپ کی نبوت کی دلیل بناتے ہیں اور آپ کے نام لیوا کلمہ گو مسلمان اس کو نبوت کے منافی سمجھ کر آپ کی احادیث پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ انا للہ پیچ ہے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ۔۔۔ کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

ایسے لوگوں سے بالکل قطع تعلق چاہیئے اور امامت وغیرہ سے ہٹا دینا چاہیئے۔ مومن کی یہ شان نہیں کہ صحیح احادیث کا انکار کرے۔

اسماء الٰہی کی حقیقت

سوال:۔ ایک جگہ تفسیر فتح البیان میں الحمد کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اسماء اللہ تؤخذ باعتبار الغایات التی ہی افعال دون المبادی التی ہی انفعالات۔ اس کی پوری تشریح بیان کریں۔ یہ علم کلام کا مسئلہ ہے!

جواب:۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو رحمٰن رحیم کہا جاتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوئے۔ کہ خدا تعالیٰ رحمت سے موصوف ہے۔ اور رحمت کے معنے رقت قلب کے ہیں۔ تو لازم آیا۔ کہ خدا تعالیٰ کے لئے قلب ہو اور قلب گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ تو معاذ اللہ خدا بھی ایسا ہوگا۔ لیکن یہ خرابی اس صورت میں لازم آتی ہے کہ خدا تعالیٰ کو باعتبار مبدا مصدری معنی کے رحمٰن رحیم کہا جائے اگر باعتبار غایت اور نتیجہ کے کہا جائے تو پھر کوئی اعتراض نہیں رقت قلب کی غایت اور نتیجہ احسان ہے یعنی جب کسی کی بابت انسان کا دل نرم ہوتا ہے۔ تو اس کے ساتھ احسان کرتا ہے۔ تو گویا خدا تعالیٰ کو رحمٰن رحیم کہنے کے یہ معنیٰ ہوئے۔ کہ خدا اپنے بندوں سے احسان کرتا ہے یہ معنیٰ ہیں فتح البیان کی عبارت کے۔ کہ خدا کے نام باعتبار غایت کے لئے جاتے ہیں۔ نہ باعتبار مبدا کے اس کی زیادہ تفصیل ہم نے آپ کے شاگرد مولوی عطاء اللہ کے رسالہ الاہتداء کی تقریظ میں کی ہے۔ جو نہایت مفید ہے۔

مولوی عطاء اللہ فریدکوٹ مکیورہ بڑی مسجد اہل حدیث

قرآن مجید کے ساتھ دم وغیرہ کرنے سے فائدہ نہ ہو تو یہ کہنا جائز ہے کہ قرآن مجید سے فائدہ نہیں ہوا؟

سوال :- زید عرصے سے خزر کھانسی، دمہ کی بیماری میں مبتلا ہے۔ ایک عامل نے قرآن مجید سے علاج کیا۔ سورۃ فاتحہ اور آیات شفا لکھ کر پلائیں، مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ زید کا خیال ہے کہ ڈاکٹری علاج کرایا جائے۔ مگر عامل نے منع کر دیا کہ قرآن مجید کے دم کو ترک کر کے تم کافر ہو جاؤ گے دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا زید ڈاکٹری حکیمی علاج کروا سکتا ہے یا نہیں، جبکہ قرآن مجید سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ قرآن مجید کی شفاء پر ایمان رکھتے ہوئے حالات کے مطابق یہ کہنا کہ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا کیا اس سے کفر لازم آتا ہے؟

جواب :- کتب احادیث میں علاج معالجہ کی بابت بکثرت احادیث موجود ہیں جن میں مادی، روحانی ہر قسم کے معالجات مذکور ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائے اور کئے ہیں۔ اگر قرآن مجید کے علاوہ اور معالجات کفر ہوتے تو معاذ اللہ، معاذ اللہ یہ کفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہوتا رہا۔ فائدہ نہ فائدہ تو خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ شفاء بھی خدا کی طرف سے ہے اور غیر قرآن کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے خدا تعالیٰ نے شہد کو شفاء للناس (پ ۱۴) فرمایا ہے تو اگر کسی بیمار کو شہد سے فائدہ نہ ہو اور اس بات کو بیان کرتا ہوا کوئی شخص کہہ دے کہ شہد سے فائدہ نہیں ہوا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ کا شفاء للناس کہنا غلط ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس خاص موقعہ پر مشیت ایزدی سے اس کا اثر رک گیا سو اس طرح قرآن شریف کو سمجھ لینا چاہیے جو شخص کسی خاص موقعہ پر فائدہ کی نفی سے قرآن مجید کے شفاء ہونے سے انکار سمجھ لیتا ہے یہ اس کی بے سمجھی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ ۱۵ صفر ۱۳۵۵ھ، ۷ اپریل ۱۹۳۶ء

تعویذات

سوال :- آیات قرآنی کے تعویذ گلے میں ڈالنا یا بازو پر باندھنا جائز ہے یا نہیں؟ جواز یا عدم جواز پر قرآن و حدیث سے کیا دلیل ہے؟

السائل :- حاجی ابراہیم حسین سیٹھ بنگلور مورخہ ۱۲ جمادی ۲۳

جواب :- مشکوٰۃ میں ہے :-